اشاعتِ خاص

ماہی

فکرِ اسلامی بستی

اپریل ۱۹۹۸ء تا ستمبر ۱۹۹۸ء

بیاد عالم ربانی عارف باللہ

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ

مدیر: محمد اسعد قاسمی

آئی ایس ایس این

شمارہ نمبر ۱۱-۱۲ — جلد نمبر ۳

ماہنامہ فکر اسلامی بستی

اپریل سنہ ۱۹۹۸ء تا ستمبر سنہ ۱۹۹۸ء

بیاد عالم ربانی عارف باللہ

مدیر: محمد اسعد قاسمی

ناشر

مرکز دعوت وارشاد دار العلوم الاسلامیہ بستی (یوپی) الہند

زر تعاون سالانہ ۶۰ روپئے — خصوصی شمارہ ۵۰ روپئے

فہرستِ عناوین

پیغامات

پیغام ــــــ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم	۴
پیغام ــــــ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم	۶
پیغام ــــــ حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب دامت برکاتہم	۸
پیغام ــــــ صاحبزادہ گرامی قدر جناب مولانا حبیب احمد صاحب باندوی مدظلہٗ	۱۰

فکر و نظر

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے ــــــ مدیر	۱۴
ایک ربانی عالم اور بزرگ شخصیت ــــــ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم	۲۱
سلفِ صالحین کا دلکش نمونہ ــــــ مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں	۳۲
ایک مردِ مومن اور فرشتہ صفت انسان ــــــ مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری	۴۰
عارف باللہ، صدیق دوراں... امتیازات و خصوصیات ــــــ مولانا عتیق احمد قاسمی	۴۹
حضرت قاری صاحبؒ اور دار العلوم الاسلامیہ ــــــ مولانا ظہیر انوار قاسمی	۷۸
حضرت باندویؒ کا تعلیمی عہد ــــــ مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی	۹۶
حضرت باندویؒ کی تدریسی زندگی ــــــ " "	۱۱۱
باتیں انکی یاد آتی ہیں بہت ــــــ مولانا محمد زکریا سنبھلی	۱۱۷
حضرت قاری صاحبؒ علم تجوید کے ایک دردمند محرک ــــــ مولانا قاری ابوالحسن اعظمی	۱۴۷
حضرت قاری صاحبؒ یادیں اور تأثرات ــــــ مولانا حکیم محمد ساجد قاسمی	۱۵۵
حضرت مولانا باندویؒ ایک ولیِ کامل ــــــ مولانا نثار احمد قاسمی	۱۶۴

کتبہٗ: امتیاز احمد قاسمی غفرلہٗ

ایں سادگی اوست	مولانا عزیز اختر قاسمی	۱۷۲
حضرت مولانا باندوی شخصیت کے کچھ نمایاں پہلو	مولانا مفتی مبارک حسین قاسمی	۱۷۸
جلال و جمال کا حسین سنگم	مولانا فیروز اختر ندوی	۱۸۴
.... لیکن تو چیزے دیگری	مولانا شہاب الدین ندوی	۱۹۰
حضرت قاری صاحبؒ اپنے اوصاف حسنہ کے آئینہ میں	مولانا قاری احمد سعد قاسمی	۱۹۵
حضرت قاری صاحبؒ: چند غیر معمول واقعات	مولانا حافظ انصار اللہ قاسمی	۲۰۲
حضرت قاری صاحبؒ: چند نقوش و تأثرات	مولانا علاؤ الدین قاسمی	۲۱۴
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں	مولوی محمد اسجد قاسمی	۲۱۹
حضرت قاری صاحبؒ: ایک عظیم روحانی شخصیت	مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی	۲۲۵

مجلات و جرائد کے چند اہم مضامین

عالم ربانی کی رحلت	مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی	۲۳۰
علم و عرفان کی مسند خالی ہو گئی	مولانا محب اللہ ندوی	۲۳۲
مَوْتُ العَالِم	مولانا عتیق الرحمن سنبھلی	۲۳۶
اسلام کا سچا خادم اٹھ گیا	مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی	۲۳۹
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا	مولانا عزیز الحسن صدیقی	۲۵۲
حضرت قاری صاحبؒ کی ملک کے خیر خواہوں سے درد مندانہ اپیل		۲۵۵

منظوم خراج عقیدت

نذر عقیدت ۔ مرقع شیخ	مولانا حکیم ابرار احمد مظاہری	۲۵۸
تأثرات	مولانا محمد عبد القیوم شاکر الاسعدی	۲۶۱
نذر عقیدت	مولانا ضیاء الرحمن ضیا نعمانی	۲۶۴
تأثرات غم	مولانا نثار احمد قاسمی	۲۶۵

۱۹؍ ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیز گرامی قدر مولوی محمد اسعد قاسمی صاحب وفقہ اللہ لما یحب ویرضیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ "فکر اسلامی" کا قاری صدیق صاحب نمبر نکال رہے ہیں، یہ تجویز ہر طرح برمحل، بروقت اور مفید و چشم کشا ہے، قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک عالم ربانی، خادم دین و علم اور نمونۂ سلف تھے آپ اس نمبر میں ہماری وہ تقریر بھی شائع کرسکتے ہیں جو رسالہ "تعمیر حیات" میں شائع ہوئی ہے، اور ہمارے خیالات و تاثرات کی کسی حد تک ترجمانی کرتی ہے،

اللہ تعالیٰ آپکو اس کا اجر دے، اور نمبر کو زیادہ سے زیادہ مفید، مقبول اور اہل علم و خادمانِ دین کیلئے شوق انگیز، حوصلہ افزا اور ہمت آفریں بنائے

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْز

مخلص
ابوالحسن علی ندوی

١٧/صفر المظفر ١٤١٩ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً

اما بعد: خواص و عوام دونوں ہی میں حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی کی شخصیت صرف جانی پہچانی و معروف ہی نہیں بلکہ دونوں ہی حلقوں میں مقبول بھی ہے، محبوب بھی ہے، اس ہر دلعزیزی پر کسی کو حیرت و تعجب کیوں ہونے لگے، جبکہ قرآن نے مومنانہ و متقیانہ زندگی سیجعل لہم الرحمٰن وداً کی اطلاع دی ہے، اور واقعات مسلسل اس قرآنی وعدہ کی تصدیق کررہے ہیں، جو کہ دوسروں کیلئے ایک مستقل درس عبرت و نصیحت ہے واقعہ یہ ہے کہ اہل اللہ و مصلحین امت کی زندگیاں اور انکے پاکیزہ حالات و واقعات یہ قیمتی سرمایہ ہیں کہ جس سے ہر دور میں استفادہ کیا جاتا رہا ہے، خود قرآن پاک نے بھی حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور انکے صالح و مخلص متبعین کا تذکرہ بطور خاص کیا ہے، تاکہ اسکو انسانیت کی اصلاح و ہدایت اور سیرت سازی میں مشعل راہ بنایا جائے، بلاشبہ حضرت مولانا کی یوں تو پوری ہی زندگی، اور اس میں پیش آنیوالے اتار چڑھاؤ و احوال و کوائف سبھی قابل ذکر ہیں، لیکن حق کی اشاعت و حفاظت اصلاح و تربیت، قرآن پاک و دینی تعلیم کیلئے مکاتب و مدارس کے قیام کا جذبہ و تڑپ، اور اس کے لئے مسلسل شبانہ روز جد و جہد، بیماری و ضعف کے باوجود دور و قریب کے دشوار گذار اسفار کا سلسلہ یہ انکی زندگی کے ایسے امتیازی اوصاف ہیں جسمیں دینی کام اور اسکی خدمت کرنیوالوں کیلئے بہت کچھ رہنمائی ہے آج کے ذہنی و فکری آزادی اور بے دینی کے ماحول میں انکی زندگی کی سرگزشت سے واقف کرانے کی بطور خاص ضرورت ہے، تاکہ خواص و عوام دونوں اس سے روشنی حاصل کرسکیں، اللہ تعالیٰ اس خصوصی اشاعت کو قبول فرماکر مفید و نافع بنائے، آمین

والسلام —— ابرار الحق

پیغام

حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب دامت برکاتہم

CODE : 05542
PHONE : 92433 & 82458
Gram : DARUL ULOOM

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بستی یوپی الہند

دار العلوم الاسلامیہ

DARUL ULOOM-AL-ISLAMIA
BASTI - 272 001 U. P. INDIA

Ref. No.... Dated ۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

امابعد! مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ سہ ماہی فکر اسلامی کے ذمہ داران حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ کی یاد میں ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہے ہیں۔ حضرت مولاناؒ کی بزرگ شخصیت، ان کے علمی و دینی مقام اور دین و ملت کیلئے ان کی مخلصانہ و خادمانہ خدمات کا یہ حق ہے کہ ہم ان کی یاد کو تازہ رکھیں، اور ان کی مومنانہ و مصلحانہ زندگی کے پیغام کو عام کریں۔

اس زمانے میں قیام مدارس اور ان کے تدریسی و تعلیمی اور تربیتی نظام کے ذریعے حضرت مولاناؒ نے جو مستحسن اقدامات کئے ہیں وہ ہم سب اہل مدارس اور علم دین کے خادموں کیلئے لائق تحسین و قابل تقلید ہیں۔

مجھے اور دار العلوم الاسلامیہ کے سبھی کارکنوں کو حضرت مولاناؒ کی شفقت و محبت اور سرپرستی حاصل رہی۔ اور دار العلوم الاسلامیہ کو درپیش مشکلات کے مقابلے میں کبھی کبھی ہم نے پوری ہمدردی اور مخلصانہ تعاون کیا۔ حضرت کے اس دعوتی تعلق کو دیکھتے ہوئے بھی اس نمبر کی ضرورت تھی۔

مجھے امید ہے کہ آپ کا رسالہ "صدیق نمبر" حضرتؒ کے پیغام کو زندہ رکھے گا اور ان کے عزم و مقاصد کے حصول کی راہ میں معاون ثابت ہوگا۔

رسالہ کے تمام کارکنان کو میں اپنی قلبی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

والسلام

محمد باقر حسین
بانی و ناظم دار العلوم الاسلامیہ بستی یوپی

۱۲ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد : مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ رسالہ "فکر اسلامی" کے ذمہ داران حضرت مولانا صدیق احمد باندوی ؒ کی یاد میں اس کا ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہے ہیں، حضرت مولاناؒ کی بزرگ شخصیت، انکے علمی و دینی مقام، اور دین و ملت کیلئے انکی مخلصانہ و مجاہدانہ مساعی کا ہم پر حق ہے کہ ہم انکی یاد کو تازہ رکھیں، اور انکی مومنانہ و مصلحانہ زندگی کے پیغام کو عام کریں۔

اس زمانے میں قیام مدارس اور انکے تدریسی و تعلیمی اصلاحی و تبلیغی نظام کے ذریعہ حضرت مولاناؒ نے جو مستحسن اقدامات کئے ہیں وہ ہم سب اہل مدارس اور علم و دین کے خادموں کیلئے لائق تحسین و قابل تقلید ہیں۔

مجھے اور دارالعلوم الاسلامیہ کے سبھی کارکنوں کو حضرت مولاناؒ کی شفقت و محبت اور سرپرستی حاصل رہی، اور دارالعلوم الاسلامیہ کو درپیش مشکلات کے مقابلے میں بھی انھوں نے ہم سے پوری ہمدردی اور مخلصانہ تعاون کیا حضرتؒ کے اس دیرینہ تعلق کو دیکھتے ہوئے بھی اس نمبر کی ضرورت تھی۔

مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ رسالہ کا "صدیقؒ نمبر" حضرتؒ کے پیغام کو زندہ رکھے گا، اور ان کے عزیز مقاصد کے حصول کی راہ میں معاون ثابت ہوگا۔

رسالہ کے تمام کارکنان کو میں اپنی قلبی تہنیت پیش کرتا ہوں۔

والسلام۔ محمد باقر حسین

بانی و صدر دارالعلوم الاسلامیہ بستی

باسمہٖ سبحانہٗ

والد صاحب علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد ہندوستان کے بیشتر رسائل نے آپ پر مضامین شائع کئے، اور بہت سے خصوصی صدیق نمبر بھی نکالے گئے، جن میں آپکی پاکیزہ زندگی کے حالات و واقعات اور انکی دینی خدمات کو امت تک پہونچانے کا فیصلہ کیا گیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان تمام حضرات کو اجر عظیم عطا فرمائے، جنھوں نے اس قیمتی سرمایہ کو لوگوں تک پہونچایا، کیونکہ اللہ والوں کی پاکیزہ زندگی قوم کی امانت ہے، یہ حقیقت ہے کہ حضرتؒ کی ذات بابرکات مجموعۂ صفات و کمالات تھی، وہ ایک درویش خدامست بزرگ تھے جن کے اخلاص و ایثار، توکل و تبتل نے طوفانِ باطل کا رخ موڑ دیا، اور اس خطۂ سرزمین کو جہاں کفر و ارتداد، ظلم و استبداد وحشت و بربریت کے مہیب بادل چھائے ہوئے تھے اپنی فراستِ ایمانی و حمیت دینی کے ذریعہ نور ولایت سے منور کر دیا اور اس سخت بنجر زمین کو اپنے علم و عرفان سے سیراب کر کے زرخیز بنا دیا، آپکی پوری زندگی ابتلاء و آزمائش میں گذری، ہر ہر کام میں رضاء الٰہی اور اتباع رسولؐ کو مدنظر رکھا، اپنی ذات سے مخلوق کو نفع رسانی کا جذبہ ہمہ وقت رہتا جیسا کہ جریدہ ہٰذا کے مضامین سے قارئین حضرات کو معلوم ہو جائے گا، غرض کہ حضرتؒ کو اللہ تعالیٰ نے تمام خوبیوں کا جامع بنایا تھا، اور بڑی محبوبیت عطا فرمائی تھی یہی وجہ ہے کہ اب جبکہ انتقال کو ایک سال کا عرصہ ہو رہا ہے، لیکن حضرت کی زندگی کے مختلف گوشوں پر مضامین کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، اس سلسلے کی ایک سعی و کوشش عزیز القدر برادرم مولانا اسعد صاحب قاسمی نے فرمائی ہے جنکے پورے گھرانے کا حضرتؒ سے خاص ربط و تعلق تھا اور انشاء اللہ رہے گا، موصوف نے بڑی دیدہ وری اور بڑے اہتمام کے ساتھ گوناگوں مضامین پر مشتمل اپنے موقر جریدہ کا خصوصی شمارہ شائع کرنے کا

فیصلہ کیا ہے، اس سلسلے میں احقر سے برابر مضمون لکھنے کی فرمائش کرتے رہے، لیکن مشغولیات اور کثرتِ اسفار نے اتنا موقع نہیں دیا کہ میں ان تمام مضامین پر نظر کرتا، جو حضرت علیہ الرحمہ کے بارے میں لکھے گئے ہیں، اور پھر کوئی ایسی بات لکھتا جس سے وہ مضامین خالی ہیں، بس اللہ تبارک و تعالیٰ مولانا موصوف کی اس سعی جمیل کو قبول فرمائے، اور اس خصوصی شمارہ کو قبول کر کے، امت کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

حبیب احمد
جامعہ عربیہ ہتورا ضلع باندہ
۱/ ۷/ ۹۸ء

فکر و نظر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

از: مدیر

دنیا کے باکمال انسانوں، جامع الجہات ہستیوں، اور عظیم شخصیتوں کیطرح ہمارے حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی بھی گوناگوں فضائل و کمالات، اور نوع بنوع خصوصیات و امتیازات کے مالک تھے، مگر ان کی جامعیت کے مختصر تعارف کے لئے ان کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ علم و عمل کے جامع تھے، یا عالم باعمل تھے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا، دنیا میں اہل علم و فضل کی کمی نہیں، لیکن اچھے اور پاکیزہ عمل کی یقیناً کمی محسوس ہوتی ہے، اور اہل علم و فکر کی بے عملی بلکہ بدعملی کی شکایتیں عام ہیں، حسن عمل کے عمومی فقدان کے موجودہ ماحول میں حضرت قاری صاحب کا حسن عمل، اصلاح و تبلیغ، اور دعوت و اقامت دین کے میدان میں انکی بے مثال فعالیت اور جوش عمل کو دیکھتے ہوئے اگر ہم یہ کہیں کہ ان کا عمل انکے علم و فضل سے بڑھا ہوا تھا، تو اس میں بھی

کوئی غلو اور مبالغہ نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس بے عملی اور بد دینی کے زمانے میں حضرت مرحوم سے دین کے جو عملی کام لئے، اور عملی میدان میں انھوں نے جو خدماتِ جلیلہ انجام دیں، وہ بس انھیں کا حصہ تھیں اور اب ان کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ دور دور تک بھیانک خاموشی اور سناٹا ہے ؎

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید، سواراں راچہ شد؟

میدانِ عمل میں بھی ان کی سرگرمیوں کا دائرہ محدود نہ تھا، بلکہ دینی زندگی کے تمام ہی تقاضوں کی انجام دہی ان کے مدِنظر تھی اور اسکے عملی نمونہ اور اسوہ حسنہ کیلئے دنیا کے سب سے بڑے معلمِ اخلاق حضرت خاتم النبیین و رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ وسنتِ مطہرہ ان کے پیشِ نظر رہتی تھی، اور اتباعِ سنّت، پیروی سیرت ان کے اعمالِ حسنہ کا مصدر و محور بنی رہتی تھی، عبادت و ریاضت، ذکر و تلاوت، تہجد اور نوافل تک کی پابندی، نماز باجماعت کے اہتمام نفلی روزوں، اور دیگر عبادات میں مشغولیت کے ساتھ ساتھ وہ ان ظاہری و باطنی اخلاقِ حسنہ سے بھی متصف تھے جن سے ہمارا معاشرہ خالی ہوتا جا رہا ہے، اور جن کی بدولت مسلمان خیرِامت کہلانے اور دنیا کی قیادت و امامت کے حقدار بن گئے تھے، اور جن کو کتاب وسنت میں "خلقِ عظیم" اور "مکارمِ اخلاق" کہا گیا ہے، ان اخلاقی فضائل کے ساتھ حضرت قاری صاحبؒ نے ایثار و قربانی، جہد وجہد، اور انتھک

محنت و مشقت، اور صبر و تسلیم سے بھری ہوئی جو زندگی گزاری ہے اسکو دیکھتے ہوئے وہ ہم جیسے تن آسانوں سے زبانِ قال سے نہیں تو زبانِ حال سے یہی کہتے رہے کہ

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جسطرح
ہم نے تمام عمر گزاری ہے اسطرح!

حضرت قاری صاحبؒ ان اخلاقِ حسنہ کے خاص مظہر تھے، جنکا تعلق دوسرے بندگانِ خدا سے بھی ہوتا ہے، چنانچہ ان میں وہ تواضع و خاکساری تھی جس کیلئے بزرگوں نے کہا ہے کہ انسان میں مٹی کی سی تواضع چاہیئے، ان سے ملنے والا کبھی یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ وہ اپنے کو کسی معاملے میں برتر اور بہتر سمجھتے ہیں، یا ان کے اندر کبر و غرور کا کوئی شائبہ بھی ہے، ان کی سادگی و بے تکلفی بھی اسی خاکساری کا نتیجہ تھی جسکے تحت وہ ہر موسم میں اور دور دراز و دشوار گزار علاقوں کے تبلیغی سفر پر روانہ ہو جاتے تھے، اور اس کیلئے سائیکل، بیل گاڑی اور یکہ تانگہ پر بیٹھنے سے بھی انھیں عار نہیں تھا۔

اسی تواضع و انکساری کا نتیجہ تھا کہ اپنے چھوٹوں کو بھی اکثر معاملات میں آگے رکھتے، اور انکی ہر طرح ہمت افزائی فرماتے تھے، مگر ہمارے معاشرے میں معاملہ برعکس ہو رہا ہے کہ بڑوں سے شفقت ختم ہو رہی ہے، اور چھوٹوں کی طرف سے بڑوں کی عزت و حرمت پامال ہو رہی ہے، جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ "مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا" (جو ہمارے چھوٹوں پر رحم

نہ کرے، اور بڑوں کی عزت نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں)۔

اپنی اسی سادگی اور بے تکلفی کے سبب وہ پرمشقت اور مجاہدہ والی زندگی گزارنے کے اس طرح عادی ہو گئے تھے کہ راحت و آرام اور سکون و اطمینان کی طلب ہی ختم ہو گئی تھی ؎

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

فرمان نبوی ؐ "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" کے مطابق حضرت قاری صاحبؒ نے بھی مدرس و معلم کی زندگی اختیار کی، اور عمر بھر درس و تدریس میں لگے رہے، اسلئے طلبہ و اساتذہ اور اہل مدارس کیلئے انکی زندگی بطور خاص مثالی نمونہ اور اسوۂ حسنہ ہے۔

سبق کیلئے پوری تیاری اور عدم ناغہ، اور مشکل مقامات کے حل کیلئے اپنے خردوں سے بھی استفادہ، صبح سے رات گئے تک درس میں مشغولیت، اور طلبہ کے مستقبل کی فکر ایسی گرانقدر چیزیں ہیں، جن کو ہر استاذ و معلم کو اپنانا چاہئے۔

اس کے ساتھ ہی طلبہ کے ساتھ پدرانہ شفقت، انکی ضروریات کی کفالت، انکی تربیت کی فکر، ان کے مستقبل سے دلچسپی ایسی باتیں ہیں جو حضرت قاری صاحبؒ کو ایک بہترین استاذ اور مثالی معلم کی حیثیت عطا کرتی ہیں، طلبہ کو مہمانان رسول ؐ کہا جاتا ہے، لیکن ان کے ساتھ ان کے شایانِ شان معاملہ نہیں کیا جاتا، حضرت قاری صاحبؒ نے اپنے مشفقانہ طرزِ عمل سے طالبانِ علومِ نبوت کے شایانِ شان معاملہ کیا،

جسکے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

مدارس سے وہ کسی نفع طلبی کے بالکل قائل نہیں تھے، اور اس سلسلے میں انکا دامن بالکل پاک تھا، اسی لئے وہ دیگر مدارس سے رشک در قابت بھی نہیں رکھتے تھے، بلکہ تمام ہی مدارس کے خیر خواہ تھے اور ان سب سے تعاون فرماتے تھے، اور ہر علاقے میں حتی الامکان مدارس کے قیام کیلئے کوشاں رہتے تھے، اکرام ضیف، اور مہمانوں کی خاطر داری میں بھی وہ بہت بلند مقام کے مالک تھے، مہمانوں کیلئے اپنی راحت و آرام ترک کر کے ان کو راحت رسانی، اور گھر والوں پر انکو ترجیح دینا انکی عادت ثانیہ بن چکی تھی، پوری بشاشت کے ساتھ مہمان داری، اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی وہ ایک جیتی جاگتی مثال تھے، جسکے بارے میں کہا گیا ہے کہ "وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" (وہ تنگدستی میں بھی اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں)

اصلاح بین الناس اور مسلم معاشرے کے اتحاد و اتفاق کی انھیں خاص فکر لاحق رہتی تھی، اس کیلئے وہ اپنی پوری طاقت لگا دیتے تھے، کسی خاندان اور کسی طبقے میں اختلاف کی انھیں خبر ملتی تو اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے تھے، جب تک کہ آپس میں صلح صفائی نہ کرا دیں اور اس کار خیر میں وہ ضد کرنے والے کے پاؤں پر اپنی ٹوپی بھی ڈالدینے سے گریز نہیں کرتے تھے، مسلم معاشرے کی بڑی خرابیوں میں آپسی اختلاف و انتشار بھی ہے جسکے خطرناک نتائج سے واقفیت کے سبب وہ اسکی طرف خاص طور پر متوجہ تھے، ضرورت ہے کہ اس معاملے میں

حضرت قاری صاحبؒ کے طرزِ عمل کو سامنے رکھا جائے، اور اصلاح بین الناس کے مبارک عمل کو جاری رکھا جائے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی شخصیت کا ایک غیر معمولی پہلو انکی تحریری و تصنیفی خدمات پر مشتمل ہے، عام طور پر تدریس و تحریر میں تضاد سا پیدا ہو گیا ہے، اور ہمارے اساتذہ و مدرّسین تحریری استعداد سے خالی نظر آتے ہیں یا مضمون نگاری تک محدود رہتے ہیں، اس کے برخلاف ہمارے حضرت قاری صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے تصنیفی صلاحیت سے بھی نوازا تھا، جسکی بدولت وہ درس نظامی کی مشکل ترین نحوی اور منطقی کتابوں "شرح جامی" "سلّم العلوم" وغیرہ کی شرح نویسی میں کامیاب ہوئے، اور اکابر علماء کی اس سنّتِ دیرینہ کو عصر حاضر میں زندہ کر کے دکھا دیا، اور انکے علاوہ بھی مختلف فنون سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں۔

ان باتوں کے پیش نظر حضرت قاری صاحبؒ کی شخصیت کا امتیازی پہلو اسکی جامعیت و ہمہ گیری ہے، وہ انسان کامل، مردِ مومن اور ایک مثالی مسلمان کا چلتا، پھرتا، جیتا، جاگتا، دلکش و دلآویز نمونہ تھے، ان کی شخصیت سیرت و سنت کے سانچے میں ڈھل کر انسانیت و شرافت، تقویٰ وطہارت، امانت و دیانت، اخلاقِ محمدیہ اور اخلاصِ فکر و عمل کا پیکرِ جمیل بن گئی تھی۔

انکی ذاتِ گرامی عصرِ حاضر کے داعیانِ دین و خادمانِ ملت کے لئے اس بات کا عملی نمونہ تھی کہ احیائے دین کیلئے کن امور پر زیادہ

زور دینے کی ضرورت ہے، اور دین کی حفاظت و اشاعت اور مسلمانوں کی سربلندی و سرفرازی کیلئے کس طرز عمل اور کس طرز حیات کو اپنانا چاہئے، ان کی فعّال، مخلص اور بے داغ شخصیت نے ہماری دینی زندگی کے جمود و تعطّل کو ختم کر کے اس میں جو حرکت و حرارت، تغیر و تموج اور خدمت دین، اتباع سنت، اصلاح و تبلیغ، تعلیم و تربیت اور انفرادی و اجتماعی اصلاح کیلئے انتہائی جد وجہد کی جو نادر مثالیں قائم کیں ان کا تقاضا ہے کہ ان قدروں کو اپنایا جائے، اور ان کو زندہ رکھا جائے، اور عملی زندگی میں انھیں اپنانے کے ساتھ تحریری طور پر بھی محفوظ کرلیا جائے،

اسکے علاوہ وہ دارالعلوم الاسلامیہ کے محرک و مؤید، بانی و سرپرست اور اسکے کارکنان کے مشفق و مربی اور ہر نازک مرحلے میں ادارہ کے حامی و مددگار اور اسکی حفاظت کیلئے سینہ سپر ہونے والے بزرگ بھی تھے، اس لئے بھی "فکر اسلامی" کے "صدیق نمبر" کی ضرورت تھی جو ملت کی طرف سے حضرت قاری صاحبؒ کیلئے خراج عقیدت بھی ہے، اور ہمارے ادارے کی طرف سے اپنے محسن و مربی کی احسان شناسی، اور انکی بزرگانہ شفقتوں اور عنایتوں کی قدردانی اور اعتراف و اقرار بھی ہے

أفادتكم النعماء مني ثلاثة ؛ يدي ولساني والضمير المحجبا

اخیر میں حضرت قاری صاحبؒ کے سلسلہ میں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مغالطہ و مبالغہ نہیں کہ :

بس رہا ہے میری آنکھوں میں وہی جانِ بہار
جس کا ہم رنگ کوئی پھول گلستاں میں نہیں

●●●

مولانا سید صدیق احمد صاحب باندویؒ

ایک ربانی عالم اور بزرگ شخصیت تھے

از: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ دامت برکاتہم

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ کے سانحۂ ارتحال پر مسجد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۳۰ راگست ۱۹۹۷ء کو ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے حضرت قاری صاحبؒ کی روحانی شخصیت اور ان کی علمی و دینی خدمات پر اہم تقریر فرمائی۔

حضرت مولانا دامت برکاتہم کی خصوصی اجازت سے ذیلی عناوین کے اضافہ کے ساتھ افادۂ عام کی غرض سے ہم اسے "مولانا قاری صدیق نمبر" میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں

(مدیر)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔

آیت کریمہ کی معجزانہ معنویت

میرے رفقائے کرام، اور طلبائے عزیز! میں نے آپکے سامنے یہ آیت پڑھی یہاں

مسجد کی طرف آتے ہوئے میرے ذہن میں اس کا القاء ہوا، اور اس سے زیادہ موزوں اور اس سے زیادہ مفید اور قابل غور تمہید نہیں ہو سکتی، اور کوئی ایسا جامع جملہ نہیں کہا جا سکتا، قرآن مجید کی یہ آیت بھی ایک مستقل معجزہ ہے، بلکہ معجزات کا مجموعہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبَّانِیِّیْنَ" لیکن تم اللہ والے بنو پھر اسکے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے رَبَّانِیِّیْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے اس میں تربیت بھی داخل ہے یعنی وہ عالم جو ایک طرف رب سے تعلق رکھتا ہو، رب سے اس کا تعلق صحیح ہو، اخلاص اسکو حاصل ہو، اور دوسری طرف اسکو ایمان و احتساب کا درجہ حاصل ہو یعنی وہ دعوت و تربیت اور اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو۔

میں عربی زبان کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے نہیں جانتا کہ کوئی لفظ اتنا جامع و معنی خیز اور ایسا توجہ طلب اور نظر افروز ہو سکتا ہے، علمائے امت اور علمائے اسلام کو اللہ تعالیٰ ربانیین کے لفظ سے یاد کرتا ہے "اللہ والے بنو" لیکن اللہ تعالیٰ کی صفت میں "رب" کا لفظ انتخاب فرمایا گیا کہ ایسے علماء بنو جنکے اندر تربیت کا مادہ ہو، تربیت کی صلاحیت بھی ہو، انھیں کو علمائے ربانیین کہتے ہیں اور پھر اس کے بعد فرمایا کہ "بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتَابَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ" تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دو، اس کے ساتھ "تَدْرُسُوْنَ" کا لفظ بھی لگایا گیا جو ہمارے اور آپ سب کیلئے قابل غور ہے کہ عالم ربانی، عالم کامل اور باکمال بن جانیکے بعد بھی ضرورت ہے کہ مطالعہ جاری رہے، استفادہ اور علمی سفر جاری رہے، علمی ترقی جاری رہے، یہ آیت تو قیامت تک پڑھی جانے والی آیت ہے اللہ تعالیٰ قیامت تک اس امت میں علماء کو پیدا کرتا رہے گا، اور پھر ایسے روحانی تربیت کرنے والے اور پھر دینی تعلیم دینے والے، اور پھر دین کیلئے کوشش و مجاہدہ کرنیوالے پیدا کرنے کی دعوت دی جاتی رہے گی تو اس لئے ایک ایک لفظ

معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ قرآنی بلاغت کا ایک نمونہ ہے۔

آیتِ کریمہ جامعِ دعوت و موعظت ہے

آج ہم جس ہستی کو یاد کرنے کیلئے اور اپنی عقیدت و محبت کا خراج پیش کرنے کیلئے اور اللہ تعالیٰ سے انکی مغفرت اور رفعِ درجات کی دعا کرنے کیلئے جمع ہوئے ہیں، اور آئندہ کیلئے بھی یہ یاد تازہ کرنے کے لئے جب کبھی مجلس ہو، محفل ہو اس پر اکتفاء نہیں، اس کے باہر بھی آپ یاد کیا کریں اس کیلئے یہ آیت مجھے القاء ہوئی، میرے ذہن میں ڈالی گئی کہ انکی بہترین تعریف ہو سکتی ہے اور تعریف ہی نہیں بلکہ ہم سب کیلئے دوا بھی ہے، یہ تقریر ندوۃ العلماء میں کیجا رہی ہے، مسجد میں کی جا رہی ہے، طلبہ و اساتذہ کے سامنے کی جا رہی ہے طالبین علوم دینیہ کے سامنے کی جا رہی ہے، جہاں آئندہ کیلئے وہ امت کے نمائندہ و ترجمان اور کتاب و سنت کے شارح اور دین حق کی طرف بلانے والے پیدا کئے جائیں گے، اور ان علماء کو تیار کرنے کیلئے یہاں مدارس قائم ہیں، انکے لئے یہ آیت ایک پوری موعظت پوری دعوت اور ایک پوری کتاب ہے۔

مولاناؒ سے تعلق کی ابتداء

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد رحمۃ اللہ علیہ جس زمانے میں مظاہر علوم میں پڑھتے تھے، پچاس، ساٹھ برس پہلے، یا اس سے زائد مدت ہو گی، میں جب حضرت شیخ الحدیثؒ کی زیارت کیلئے جایا کرتا تھا، یا رائے پور جایا کرتا تھا تو سہارنپور ٹھہرتا ہوا جاتا یا واپسی میں ٹھہرتا تو مظاہر علوم بھی جاتا تھا، اسوقت ہمارے تعلق والے تین عزیز تھے ایک ہمارے عزیز بھانجے مولوی محمد ثانی حسنی مرحوم، اور ایک ہمارے یہاں دار العلوم کے بڑے کارکن بننے والے مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم بستوی، اور ایک مولانا قاری

سید صدیق احمد صاحبؒ یہ تینوں اکثر ساتھ ہی ملتے تھے، وضو کر رہے ہیں تو دیکھا تینوں ساتھ ہی وضو کر رہے ہیں، نماز میں کھڑے ہوتے تو تینوں ساتھ ہی میں کھڑے ہوتے ہیں مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کے یہاں التزاماً جایا کرتا تھا، ان سے ان تینوں کا روحانی تعلق تھا، انھیں سے وہ مجاز تھے، تو مظاہر علوم میں ان تینوں سے ساتھ ساتھ ملاقات ہوتی تھی، ان سے اس وقت سے تعارف ہے، اسکے بعد فارغ ہو کر نکلے تو پھر انہوں نے پہلے تو فتحپور کے مدرسہ میں جو مولانا ظہور الاسلام صاحبؒ کا قائم کیا ہوا تھا مولوی عبدالرحیم فتحپوری اس کے اسوقت مہتمم تھے وہاں کچھ عرصہ تک پڑھاتے رہے، فتحپور سے ہمارا قرابتی تعلق بھی ہے، جوار کا بھی تعلق ہے، وہاں جاتے تھے تو اس مدرسہ میں حاضر ہوتے تھے، وہاں مولانا قاری سید صدیق احمدؒ سے ملاقات ہوتی تھی، وہ بہت خصوصیت کیساتھ ملتے تھے پھر اس کے بعد بعض وجوہ کی بناء پر انھوں نے اپنے وطن ہی کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا، اور مدرسہ قائم کیا،

مدارس جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتے

صرف قائم ہی نہیں کیا، بلکہ مدرسہ کے ساتھ انھوں نے عام مسلمانوں اور ملت اسلامیہ کی اصلاح و تربیت، اور اسکی دعوت کو اپنا فرض سمجھا، اور یہی مدارس کی حقیقت اور ان کا اصل فریضہ ہے، اور یہی مدارس کے نظام میں شامل ہے کہ مدارس جزیرہ نہیں بن سکتے، جو مدارس جزیرہ بن جاتے ہیں وہ ڈوب جاتے ہیں، مدارس کیلئے ضروری ہے کہ وہ باہر سے اپنا تعلق رکھیں، اور یہ سمجھیں کہ باہر کی فضا اور باہر کا ماحول اگر ٹھیک نہ ہو تو ان مدارس کا بھی قائم رہنا مشکل ہوگا، کوئی بھی چیز دنیا میں جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتی، مدارس بھی ایک جزیرہ بن کر نہیں رہ سکتے، انکے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اثرات کو پھیلائیں، اور

ایسا ماحول پیدا کریں جو انکے لئے مناسب ہو، مفید ہو۔

حضرت مولاناؒ کی بصیرت اور توفیقِ الٰہی

حضرت مولاناؒ کی بصیرت و شرحِ صدر اور توفیقِ الٰہی کی بات تھی کہ انھوں نے دونوں کام ایک ساتھ شروع کئے، ایک طرف مدرسہ اور دوسری طرف آس پاس کی بستیوں سے، اس کے شہروں سے رابطہ قائم کرنا، اور بار بار جانا اور دعوت کا کام کرنا، اور دینی جلسوں میں شریک ہونا اور انکو صحیح عقیدہ اور اصلاحِ نفس کا پیغام دینا، اس سے انکی مصروفیت اتنی بڑھی، انکے مجاہدے اتنے بڑھے کہ بعض مرتبہ مجھے بھی اس تعلق کی بناء پر جو انکی ذات سے تھا، اور ان کا ہمارے خاندان والوں سے تھا، اور حضرت سیّد احمد شہیدؒ سے تو انکو بڑا تعلق تھا، تو اس بناء پر بھی، اور پھر انکی افادیت اور انکی زندگی کی قیمت کی بناء پر بھی میں نے بعض مرتبہ یہ پیغام بھیجا کہ آپ اتنا دور دراز کا سفر کرتے ہیں اور جفاکشی کرتے ہیں اور احتیاط نہیں کرتے تو یہ مناسب نہیں۔

مولاناؒ مغلوب الحال اور مجذوب صفت تھے

ان کا یہ حال تھا اور وہ اس بارے میں مجذوب الفکر تھے، مجذوب الحال تھے، وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ ان کو کیسا تعب ہوگا، اور انکی صحت پر کیا اثر پڑے گا، پھر انکی صحت پر اثر پڑا، حقیقت میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ علمائے ربانیین میں تھے "وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبَّانِیّٖنَ" کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے دین کی تعلیم کا بھی کام لیا اور دین کی اشاعت کا بھی اور اصلاح کا بھی، اور شریعت پر اور سنّت پر عمل کرنے کا بھی۔ رسوم و بدعات جو مسلمانوں کی زندگیوں میں شامل ہو گئی ہیں اسکے خلاف تقریر کرنا، لوگوں کو متوجہ کرنا، بڑے انہماک اور تندہی بلکہ ایک طرح سے مدہوشی کے ساتھ اپنی صحت

کی طرف سے آنکھیں بند کرکے، ان سب سے بے پرواہ ہوکر، عبادت سمجھ کر یہ کام کرتے تھے اور جو چیز انکی امتیازی ہے وہ ایمان واحتساب ہے، اور یہی ربانیین کیلئے ضروری ہے کہ جو کام بھی کیا جائے، اللہ کی رضا ہی کیلئے کیا جائے، اللہ کی قدرت اور استعانت پر یقین کرتے ہوئے بھی، اور پھر اجر و ثواب کی لالچ سے کیا جائے، یہ بات اس وقت ادنیٰ تنقیص کے بغیر، تنقیص تو بڑی چیز ہے، ادنیٰ تنقید کے بغیر میں کہتا ہوں کہ کوئی مقابلہ نہیں ہے، علماء ہیں، میں مقابلہ نہیں کرتا، سب اپنی جگہ قابل احترام ہیں، الحمد للہ بعض ہستیاں یہاں بھی موجود ہیں، اور جو اللہ کے یہاں چلے گئے انکے درجے بلند کرے، لیکن بہر حال اپنے مطالعہ و واقفیت کا مسئلہ ہے کہ ہم نے اپنے مطالعہ و واقفیت کے حدود میں مولانا کو جس درجہ کا مخلص جس درجہ کا فکرمند جس درجہ کا سرفروش کہنا چاہئے، اور اپنی زندگی و صحت کو خطرہ میں ڈالنے والا دیکھا ہے ویسا بہت کم دیکھا ہے۔

مقبولیتِ عامہ اور ہر دلعزیزی

اور اسی کا نتیجہ ہے کہ انکی وفات پر اس مقبولیتِ عامہ کا اظہار ہوا جو عرصہ سے کسی ہستی کے بارے میں ہمارے علم میں نہیں آئی، اللہ کے یہاں کس کا کیا درجہ ہے اللہ جانتا ہے، اور اسی کا اعتبار ہے، اور ایسا بھی بہت ہوا ہے کہ اللہ کے بعض بندے دنیا سے ایسے گئے کہ نماز جنازہ کی نوبت نہیں آئی، میں تین آدمیوں کا نام لیتا ہوں، ایک "سیرت رحمۃ للعالمین" کے مصنف حضرت مولانا قاضی سلیمان منصورپوریؒ انکی میں نے زیارت بھی کی ہے، ان کا انتقال جہاز پر ہوا، اور انکی لاش سمندر کے سپرد کردی گئی، اور ایک حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ ان کا بھی انتقال جہاز پر ہوا، اور انکی لاش بھی سمندر کے سپرد کردی گئی، مجھے خوب یاد ہے کہ وہ بمبئی میں تھے، کرلا محلے میں ٹھہرے ہوئے تھے، تو کسی جگہ شام کو چائے کی

کی دعوت تھی، اور ہم حجاز سے واپس آئے تھے، مولانا منظور صاحب بھی موجود تھے، اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ بھی تشریف رکھتے تھے، وہاں ہمیں قریب بلایا یہاں تک کہ آخری نشست گاہ پر بٹھالیا، اور کان کے پاس منہ لاکر رازداری کے ساتھ کہا کہ دعا کرو، اللہ وہاں پہونچا دے، ہمارے ذہن میں آیا کہ ان سے کہیں کہ صبح جہاز سے روانہ ہو رہے ہیں آپ ہمیں کیا تردد کی بات ہے کہ پہونچ جائیں گے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انکے سامنے یہ بات وارد ہوئی تھی، انھیں شبہ تھا چنانچہ یہی ہوا کہ انکا جہاز پر انتقال ہوا، اور وہاں انکے تعلق والوں نے سعودیہ سے ٹیلی فون کے ذریعہ رابطہ قائم کیا کہ ہم انکی لاش کو یہاں لانا چاہتے ہیں، انھوں نے اجازت دی کہ تدفین ہو سکتی ہے لیکن قبل اسکے کہ نیچے والوں تک یہ پیغام پہونچے اوپر والوں نے سنا اور نیچے والے لاش مبارک لے گئے، اور سمندر کے سپرد کردی اور کیا ہو سکتا ہے سمندر میں، انھوں نے دیر کی وہاں تک پیغام پہونچانے میں تو انھوں نے سمندر کے حوالہ کر دیا، اور ایک تیسرے بزرگ مفتی عنایت احمد کاکوروی تھے انکی درسی کتابیں نصاب میں داخل ہیں ان کا بھی انتقال سمندر میں ہوا، اور وہ سمندر کے سپرد کر دئے گئے، ایسا بھی ہوا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کو علم ہے کہ کس کا کیا درجہ ہے، اس سے کوئی تنقیص نہیں ہوتی ہے، اصل چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انکے ساتھ جو معاملہ ہو اللہ تعالیٰ جس طرح جانتا ہے اسکو علم ہے اور جو قدر ہے انکے یہاں وہ سارے ازدحام، وہ سارے جلوس، جلسے اور ماتم اور پھر یہاں تک کہ انکی تصنیف و تالیف، ان سب سے بالاتر چیز یہ ہے کہ اللہ راضی ہو، انتقال کہیں بھی ہو "وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ، وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا" یہ سب کچھ ہے، لیکن یہ ایک ظاہری علامت ہے کہ انکے انتقال پر جس طریقہ

سے یہاں مسلمانوں نے صرف انکے وطن کے نہیں، بلکہ دور دور کے مسلمانوں نے اس تعلق کا اظہار کیا یہ بہت کم دیکھنے میں آیا، ہزاروں ہزار کا مجمع تھا، ہمارے یہاں سے الحمد للہ ہمارے عزیز مولانا سید محمد رابع ندوی مہتمم دار العلوم اور انکے بھائی مولانا سید واضح رشید ندوی یہ لوگ بھی گئے، اور یہاں آکر بیان کیا کہ کئی کلومیٹر تک سواریاں کھڑی تھیں، بسیں بھی تھیں اور موٹریں بھی، اور انکو پیدل چلنا پڑا، اور پھر اس کے بعد وہاں ہزاروں ہزار کا مجمع تھا، اور آج کے "قومی آواز" میں بھی جگہ جگہ انکے انتقال پر جس تأثر کا اظہار کیا گیا، مسلمانوں نے جس عقیدت کا اظہار کیا وہ چیزیں آج کے اخبار میں شائع ہوئی ہیں اور شائع ہوتی رہیں گی۔

مولانا کی سیرت کا پیغام

میرے عزیزو! آپ کیلئے صرف اتنی بات نہیں کہ یہ فریضہ ادا کیا جا رہا ہے، ایک ضابطہ کی بات ہے کہ تعزیتی جلسہ ہو رہا ہے، ہم آپکو دعوت دیتے ہیں کہ آپ انکی زندگی پر غور کریں کہ انکو یہ مقبولیت کیوں حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ کے یہاں انکو یہ مقام کیوں ملا اور ایک عالم کو، ایک دینی مدرسہ کے فارغ کو، کسکو اپنا مقتدیٰ بنانا چاہیئے، اور کیا اس کو طرز اختیار کرنا چاہیئے، اور کسطرح اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیئے، اور کس جامعیت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے کہ ایک طرف تو علم راسخ ہو، علوم نبویہ پر پورے طور پر قدرت ہو، استحکام ہو، اتقان ہو، اتقان علمی ہو، پھر اس کے ساتھ ساتھ عمل ہو، عالم کے شایانِ شان جو عمل ہے، جو ذوق عبادت ہے، جو ذوقِ طاعت ہے، اور جو ایمان واحتساب کا مادہ ہے، وہ پیدا ہونا چاہیئے کہ آج ہم اللہ کی رضا کیلئے پڑھ رہے ہیں، اور ہم یہاں سے فارغ ہونیکے بعد دین کا کام کریں گے، یہ نہیں کہ پڑھ کر نکلے، اور خلیج چلو، دبی چلو، شارقہ چلو، سعودی عرب چلو کا جذبہ بیدار ہو گیا، نام تو حج وعمرہ کا لیکن مقصود یہ ہو کہ کہیں جگہ مل

جائے، اور مل بھی جاتی ہے، کوئی صاحب کسی سفری ایجنٹ کے یہاں کام کر رہے ہیں کوئی صاحب دواؤں والی دکان میں کام کر رہے ہیں، اور کچھ نہیں تو مسجد کے مؤذن بن گئے، خطیب بن گئے، یہ اس علم کی قیمت نہیں، یہ "کُونُوا رَبَّانِيِّينَ" کے انداز کی بات نہیں، یہ اس کے خلاف ہے، "کُونُوا رَبَّانِيِّينَ" یہ ہے کہ آپ نیت کریں کہ آپ یہاں سے نکلنے کے بعد قاری صدیق صاحبؒ کے نقش قدم پر چلیں گے اور علمائے ربانیین جو ان سے پہلے کے ہیں، یا انکے زمانے کے تھے، یا اب بھی ہیں، خدا کے فضل سے دنیا خالی نہیں ہے، ہندوستان بھی خالی نہیں ہے انکے نقش قدم پر چلیں گے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ، حضرت مولانا اشرفعلی تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نقش قدم پر چلیں گے۔

عصری مسائل اور ندوی فضلاء کی خدمات

مولانا سید سلیمان ندویؒ
مولانا عبد الباری ندویؒ

اور ندوہ کے دوسرے علمائے ربانیین ہیں، جنھوں نے وقت کے مسائل اور خطرات کا اندازہ کیا، دین میں جو تبدیلی ہو رہی تھی، اور جو تبدیلی لوگ کرتے تھے، اور اس کیلئے ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، وہاں تقریر بھی کی گئی، علم کلام پر کتابیں بھی لکھی گئیں، ان میں ہر چیز کو موجودہ مغربی فکر کے مطابق، اور اسکو سائنس کی روشنی میں قابل عمل ثابت کرنے کیلئے قرآن مجید اور انبیاء کے معجزات تک کو بھی نشانہ بنایا گیا کہ گویا وہ معجزہ نہیں تھا، بلکہ وہ ایک طبعی امر تھا۔
الحمد للہ ہمارے ندوی فضلاء نے وقت کے فتنوں کا نوٹس لیا، اور اس کو محسوس کیا، اور پھر اسکے بعد انھوں نے دین کو اپنی شکل پر رہنے کیلئے کوشش کی کہ دین میں کوئی تحریف نہ ہو، اور انحراف نہ ہو، یا در کھئے کہ انحراف اور تحریف

دو چیزیں ہیں، ایک انحراف ہے اس کا تعلق عوام سے ہے، اور تحریف کا تعلق ذی علم سے ہے، اور انحراف و تحریف دونوں سے حفاظت کا کام ہر ملک میں تقریباً انجام پایا، اسکے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو اسکی توفیق دی، اور یہ کام مغرب اقصیٰ میں بھی ہوا مراکش، الجزائر میں بھی ہوا، یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو توفیق دی، انھوں نے دین صحیح کی دعوت دی، اور قرآن مجید کی آیات اور معجزات قرآنی اور محکمات کی وضاحت کی، اور جو حدیث کے تزئیلی پہلو ہیں ان سب کو ثابت کیا۔

مولانا عبد الباری صاحبؒ نے اپنی کتاب "مذہب و سائنس" میں یہ بات ظاہر کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ مذہب اور سائنس کی کہیں ٹکر ہو ہی نہیں سکتی، جسطرح موٹر اور کشتی کی ٹکر نہیں ہو سکتی، ریلوے اور جہاز کی ٹکر نہیں ہو سکتی، کشتی چلتی ہے پانی میں، موٹر اور ریل چلتی ہے خشکی میں، یہ کہاں سے ٹکرائے گی انکے ٹکرانے کا امکان ہی نہیں ہے، یہ جو خیال پیدا کیا گیا کہ علم و دین میں ٹکراؤ ہے، جمع نہیں ہونے پاتے ان سب چیزوں کے ہونے کی علم تصدیق نہیں کرتا ہے، یہ سب غلط ہے، اس لئے کہ وہ تو ایک قادر مطلق کا عمل ہے، اس کا حکم ہے "إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ" اس مسئلے پر میں نے انکی کتاب پڑھی، یہ کتاب یقین افروز ہے، الحمد للہ ہمارے عزیز مولوی واضح نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اور ہم نے مقدمہ لکھا، اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے معجزات کے بارے میں سیرۃ النبی میں، خطبات مدراس، اور دیگر کتابوں میں اسکو علمی زبان میں ثابت کیا ہے اور جو تناقض اور تضاد بتایا جاتا تھا، اسکو دفع کیا ہے۔

آخری بات

بس میرے عزیزو! آپکو علمائے ربانیین کا نمونہ بنا چاہئے، اور دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کتنا کام لیا

اور اب کس طرح مقبولیت ظاہر ہوئی، اور خدا جانے کتنے بڑے بڑے مفکر، ادیب وشاعر گذر گئے کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ انتقال کہاں ہوا، کہاں مرے، ایک تو اللہ کے بندے وہ ہیں، جو اگر غار کے اندر ہوں، یا پہاڑ کی چوٹی پر، اللہ تعالیٰ ہزار دل لاکھوں کو انکی طرف متوجہ کر دیتا ہے، اور پھر جو انکے لئے دعائے مغفرت ہوتی ہے جو ایصال ثواب ہوتا ہے، جو محبت کیجاتی ہے، جو عقیدت ہوتی ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں، بس آپ اس سے فائدہ اٹھائیے اور عبرت حاصل کیجئے، اور یہ اعجاز ہے قرآن مجید کا، قیامت تک رہنے والی کتاب کا کہ تعلیم کے ساتھ درس بھی ہو پڑھنا بھی چاہئے اور پڑھانا بھی، پڑھتے بھی رہو سکھاتے بھی رہو تو فائدہ ہوئیگا، بس اللہ تعالیٰ توفیق دے، اور قاری صاحبؒ کیلئے دعا بھی کرتے رہیں اور ہم آپ سے کہتے ہیں کہ آپ اپنے طور پر بھی ایصال ثواب کریں۔
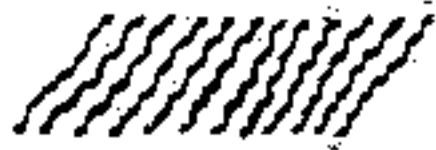
عارف باللہ حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ
سلف صالحین کا ایک دلکش نمونہ

از: مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں
(استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی)

چند مہینوں کے فرق کیساتھ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے انتقالِ پرملال کے بعد ملّت اسلامیہ ہند کو اسی طرح کے دوسرے حادثے اور المیے سے دوچار ہونا پڑا یعنی ولیِ عصر و عالم ربّانی حضرت مولانا سیّد صدیق احمد باندویؒ کی وفات حسرت آیات کا غم بھی سہنا اور دہرا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت مولانا باندویؒ کی صحت اور چستی و مستعدی کو دیکھتے ہوئے، ان کی وفات غیر متوقع تھی، اور امید ہی تھی کہ ہم سب انکے انفاس قدسیہ اور فیوض و برکات سے تادیر مستفید و متمتع ہوتے رہیں گے، مدارسِ دینیہ کے تعلیمی و تربیتی نظام میں انکے الہامی مشورے ملتے رہیں گے، تبلیغ و دعوت کے کارکنوں کو انکے مثالی ایمان و یقین، بلند ہمتی و اولوالعزمی، صبر و ثبات اور روحانی سوز و گداز سے فیضان ملتا رہے گا، اور عوام الناس آپکی مسیحا نفسی، مقبول و مستجاب دعاؤں اور قرآن و حدیث پر مبنی تیر بہدف تعویذوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے، مگر افسوس صد افسوس

کہ چشم زدن میں وہ روحانی مسیحا بیمار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے راہی ملک عدم ہوگیا اور ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو یتیمی اور محرومی کا سامنا کرنا پڑ گیا، مرنا سب کے لئے مقدر ہے، مگر علمائے ربانی کی موت ایک عالم کی موت ہوتی ہے، اور بقول نبوی اس سے دینی سرگرمیوں میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت و مشیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں مایوس ہونے کے بجائے اس کے فضل و کرم کی بھی امید رکھنی چاہئے، اور شیوۂ تسلیم و رضا اپنانا چاہئے کہ قضا و قدر کے معاملا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں، اور کارخانۂ عالم کے مصالح وہی جانتا ہے "لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلُّ شَیْئٍ عِنْدَہٗ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔"

اپنی شعوری زندگی کے چالیس سالہ عرصے میں جن علماء و مشائخ کے علم و عمل کی جامعیت روحانیت و ربانیت، عوامی مرجعیت اور قبول عام کا دل و دماغ پر گہرا نقش و تاثر قائم ہوا، ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، امیر تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں، اور ان کے بعد حضرت مولانا باندویؒ کی ذات ستودہ صفات مغتنمات میں تھی جو ملت کی مذکورہ بالا بابرکت ہستیوں سے جا ملی، اور رحمت حق سے وابستہ ہو گئی،

حضرت مولانا باندویؒ کا نام نامی آج سے قریب چالیس سال پہلے اپنے رفیق درس مولانا عبدالرب قاسمی گونڈوی (استاذ مدرسہ فرقانیہ گونڈہ) سے سنا تھا، جب وہ مولانا باندویؒ کے مدرسہ عربیہ ہتھورا (باندہ) میں کچھ عرصے رہ کر مدرسہ فرقانیہ میں داخل ہوئے تھے، انکی زبانی مولانا مرحوم کی سادگی

وتواضع، اور مدرسہ کی تعمیر میں مزدوروں کیساتھ عملی شرکت کا حال سن کران سے ایک تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا جو دن بدن بڑھتا ہی گیا، اور دس سال کے بعد ندوۃ العلماء میں قیام کے زمانے میں حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب مدظلہ العالی اور مولانا محمد مرتضیٰ صاحب بستوی مرحوم کے پاس انھیں آتے جاتے دیکھ کر خبر نظر میں، اور غائبانہ تذکرہ مشاہدہ وتجربہ میں بدل گیا، اور عقیدت میں اور اضافہ کر گیا ہے،

وكانت محادثة الركبان تخبرنا عن جعفر بن فلاح اطيب الخبر

فلما التقينا فوالله ما سمعت اذنى بالحسن مما قد رأى بصرى

(قافلہ والوں کی باتوں سے جعفر بن فلاح کے بارے میں اچھی اچھی خبریں ملتی رہتی تھیں پھر جب ہم ملے اور اسے دیکھا تو بخدا ایسا لگا کہ میرے کانوں نے اس سے زیادہ بہتر نہیں سنا جو میری آنکھوں نے دیکھا)۔

حضرت مولانا باندویؒ سے عقیدت ومحبت کے باوجود انکی قربت وصحبت سے محرومی کا مجھے بیحد افسوس ہے، اور برابر رہے گا، سلام ومصافحہ اور چند مجلسوں میں یکجا ہونے سے زیادہ ان سے استفادہ نہ کرسکا، اور یہی سوچتا رہا کہ حضرت مولانا سے اخلاص ومحبت کافی ہوجائیگی سہ

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبرِ کامل

کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

کہا جاتا ہے کہ پہلا تاثر ہی صحیح ہوتا ہے، یہ مثل حضرت مولانا صدیق احمد پر پوری طرح صادق آتی تھی کہ انکو پہلے پہل دیکھنے والا بھی انکی دلکش روحانی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، اس سیدزادے کا معصوم چہرہ دیکھنے والا بھی ان کے جد امجد کا روئے انور دیکھنے والے کی طرح یہ گواہی دینے پر اپنے کو مجبور پاتا تھا، کہ "واللہ انہ لیس بوجہ کذاب" (بخدا یہ چہرہ کسی کذاب کا نہیں ہوسکتا)

آنکھوں سے ہمیشہ شب بیداری و سحر خیزی کے آثار نمایاں رہتے تھے اور دل کے سوز و گداز، تعلق باللہ اور رخدار سیدگی کے جلال و جمال کے جلوے دیکھنے والوں کو صاف محسوس ہوتے تھے ؎

تو شبانہ می نمائی بہ برے کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد! (خسروؒ)

صوفیاء و مشائخ کی جو گوشیہ ٹوپی ہلکی پگڑی یا رومال اور ڈھیلے ڈھالے کرتے پاجامے سے انکے اتباع سنت اور سادگی و تواضع کا صاف اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس شخصیت کا ظاہر و باطن بالکل ایک ہے، اور یہ کہ شخصیت کی عظمت بزرگی اور برگزیدگی چھپانے کیلئے اسیر سیدھے سادے لباس کا پردہ ڈال دیا گیا ہے، ظاہر بین آنکھوں سے دیکھا ہوا میرا تاثر یہی ہے۔ ان کی ذہنی کیفیات قلبی جذبات اور روحانی درجات کا اندازہ تو کوئی صاحب دل اور صاحب حال ہی کرسکتا ہے، انھیں ظاہری تاثرات میں ایک تاثر انکی کم گوئی کا بھی ہے کہ نہایت دھیمے اور سنجیدہ لہجے میں سیدھی سادی گفتگو فرماتے، اور تقریر بھی گفتگو اور بات چیت ہی کے انداز کی ہوتی تھی، مگر ان سیدھے سادے جملوں اور پر خلوص باتوں کا وہی اثر ہوتا تھا جو بڑے بوڑھوں، اور خاندانی بزرگوں کے پند و نصائح کا ہوتا ہے، جو لفاظی اور سخن سازی سے خالی اور سراسر خلوص و خیر خواہی پر مبنی ہوتے ہیں؛ انکی سیدھی سادی تقریر کے زبردست اور گہرے اثرات پر حیرت ہوتی تھی کہ یا اللہ! اس تقریر میں کونسی خاص بات ہے، مگر تھوڑے سے غور سے یہ راز معلوم ہوجاتا تھا کہ تاثیر تقریر پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ کتاب و سنت سے مطابقت، تعلق باللہ، حب نبوی، اتباع سنت، اخلاص و حسن نیت

اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبۂ صادق، اور مخاطب کیلئے خلوص و خیر خواہی، اور بہر حال توفیق الٰہی کا ثمرہ و نتیجہ ہوتی ہے، ورنہ پیشہ ور واعظوں کے پیچھے دار، زور دار اور دھواں دھار تقریریں بھی پھلجھڑی کی طرح بے اثر ہو کر رہ جاتی ہیں، اور ان پر جگر مرحوم کا شعر صادق آتا ہے کہ ؎

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر میں علم و عمل کا اجتماع بھی ہے جس کا باہمی رشتہ ایک عرصے سے ٹوٹتا نظر آرہا ہے، علماء میں اگر کچھ عملی نمونے ملتے ہیں تو صوفیہ و مشائخ میں علمی ذوق کا فقدان ہے، بلکہ اب تو مادیت اور ظاہر پسندی کے اس دور میں علماء علم سے اور مشائخ عمل سے بھی دور ہو رہے ہیں اور عوام تو کالانعام ہیں ہی، ان مایوس کن حالات میں اگر کہیں علم و عمل کی روشنی نظر آتی ہے تو بسا غنیمت معلوم ہوتی ہے، اور اگر کہیں علم و عمل کا اجتماع نظر آتا ہے تو وہ غنیمتِ کبریٰ، نعمتِ عظمیٰ اور کبریت احمر معلوم ہوتا ہے،

حضرت باندویؒ نے جس محنت و مشقت سے علم حاصل کیا تھا، اسی محنت و محبوبیت کے ساتھ اس کے درس و تدریس، مذاکرہ و مطالعہ اور شرح و تحشیہ میں بھی مشغول رہتے تھے، درس و تدریس سے ان کو ایسی فطری و طبعی مناسبت تھی اور ان کو اس میں ایسی لذت و راحت ملتی تھی جو شاید دنیا کی کسی اور شے میں نہیں ملتی تھی، چنانچہ وہ سفر و حضر ہر جگہ درس میں مشغول رہنا پسند کرتے تھے اور اس کیلئے کھانا پینا، آرام و استراحت سب کچھ بھول جاتے تھے، لمبے سے لمبے سفر سے واپسی پر بھی پورے ذوق و شوق کے ساتھ سبق پڑھانے لگتے تھے۔

ان کے تلامذہ کا بیان ہے کہ درس سے پہلے اس کی پوری تیاری اور مطالعہ کرتے تھے، اور عبارت و معنیٰ طلبہ ہی سے حل کرانے کی کوشش کرتے تھے جو درس کا ایک کامیاب اور مجرّب طریقہ ہے، اس سلسلے میں انکے علمی تواضع کا یہ حال تھا کہ سمجھ میں نہ آنیوالی پیچیدہ عبارت اور مسئلہ کے بارے میں بے تکلف اپنے چھوٹوں سے بھی مدد لینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے تھے، یہ مدارس کی تعلیمی زندگی کی ایسی صفت ہے جو بالکل نایاب ہو چکی ہے، اور اب تو یہ حال ہے کہ چھوٹے اساتذہ بھی اپنے بڑے اساتذہ سے استفادہ شرم کی بات سمجھتے ہیں، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود بھی لاعلم رہتے، اور اپنے طلبہ کو بھی لاعلم رکھتے ہیں ؎

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

مدارس کے نظام میں علوم دینیہ کی طرف زیادہ توجہ دیجاتی ہے، اور علوم آلیہ صرف و نحو، منطق و فلسفہ اور بلاغت کو کمتر سمجھا جاتا ہے، مگر مولاناؒ نے دونوں علوم پر توجہ دی، اور سلّم و شرح جامی وغیرہ کی بہترین شرحیں تحریر کیں، اور علمی تبحّر و جامعیت کا ایک لائق تقلید نمونہ پیش کیا، ضرورت ہے کہ انکے تقویٰ و تقدس کے اعتراف کے ساتھ انکی علمی و تحریری خدمات کا بھی تحقیقی جائزہ لیا جائے، اور انکے علمی افادات کو عام کیا جائے۔

حضرت قاری صدیق صاحبؒ کی سیرت کا اصل جوہر اتباع سنّت و شریعت تھا، جو انکے علم و عمل، رفتار و گفتار، اور زندگی کی ہر مشغولیت میں نمایاں رہتا تھا، سنّت نبویہ سے محبت اور اس سے عملی وابستگی و پیروی کے سبب ان کی زندگی میں سلفِ صالحین کی پاکیزہ سیرتوں کی جھلکیاں پیدا ہو گئی تھیں جو اس دورِ تاریک میں دور دور نظر نہیں آتی ہیں، انھوں نے صوفیاء و مشائخ

کی طرح خانقاہیں اور درگاہیں نہیں قائم کیں بلکہ اپنی ساری طاقت وصلاحیت مدارس دینیہ کے قیام واستحکام اور خاص طور سے دیہاتی علاقوں میں دعوت وتبلیغ میں صرف کردی جہاں کے غریب وجاہل عوام علم ودین کے مشتاق ہونے کے باوجود محروم رہتے ہیں، اور جہاں ہمارے اکابر ومشاہیر علماء کو جانے میں تکلف ہوتا ہے یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا باوجود مدرسہ کے تربیت یافتہ ہونے کے عصری تعلیم کی ضرورت کا بھی احساس رکھتے تھے، اور حسب ضرورت مسلمانوں کو جدید تعلیمی ادارے بھی کھولنے اور انھیں چلانے کی ترغیب دیتے تھے، انھوں نے دیہاتی اور پسماندہ علاقوں میں اپنی تعلیمی وتبلیغی سرگرمیوں کا رخ موڑ دیا، اور وہاں مکاتب ومساجد کے قیام کو ترجیح دی، انھیں بجا طور پر اندیشہ تھا کہ دیہاتوں میں دینی مدارس ومساجد نہ ہونے سے دین سے ناواقفیت بڑھتی جارہی ہے، اور ان علاقوں میں بدعت وجہالت اور جاہلی رسم ورواج کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں، انکے پیش نظر شاید یہ بھی تھا کہ دیہاتی وقصباتی ذہن سادہ ومستعد ہوتے ہیں، اور ان پر علم دین کے نقوش وآثار بآسانی ثبت ہوسکتے ہیں، اور پھر وہ شہروں میں جاکر بہتر طور سے علمی ودینی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

دین سے عوامی دلچسپی اور ربط وتعلق قائم رکھنے کیلئے اور خدمت خلق کے جذبے کے تحت انھوں نے دعا وتعویذ سے بھی اشتغال رکھا تاکہ لوگوں کو فائدہ پہونچے، غیر مسلم بھی اسلام اور مسلمانوں سے قریب آئیں چنانچہ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بندیل کھنڈ کے اس بدنام علاقے میں مسلمانوں سے دوری کم ہوئی، اور علاقے کے غیر مسلم ان کا احترام کرنے اور انھیں "بابا" کے لقب سے پکارنے لگے، انھیں مسلم وغیر مسلم عوام میں ایسی مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی

جس کا وعدہ ہم قرآن مجید میں اور جس کا ذکر اکابر اولیاء اللہ کے تذکروں میں پاتے ہیں اور جو موجودہ زمانے میں ایک نایاب چیز بن گئی ہے۔

دین کو امکانی حد تک اسکے تمام پہلوؤں اور شعبوں کے ساتھ نافذ کرنے اور سنت و سیرتِ اسلاف کی دیرینہ روایت کی خدمت و حفاظت کے ساتھ اس امانت کو نئی نسلوں تک پہونچانے کیلئے انھوں نے اپنی ساری علمی و عملی صلاحیتیں صرف کردیں اعلاءِ کلمۃ اللہ، احیائے سنّت " اور خدمتِ خلق کے جو ذرائع ووسائل بھی ان کے بس میں تھے ان میں انھوں نے کوئی کمی وکوتاہی نہیں کی! اور ایک صاحب عقیدہ مردِ مومن، ایک صاحب دعوت وعزیمت عالم وعارف، ایک باضمیر و باشعور انسان کی طرح انھوں نے نہ صرف اپنے فرائض انجام دئے، بلکہ نوافل و مستحبات کو بھی فرائض وواجبات کی طرح انجام دیا، اور انسان اس سے زیادہ کا مکلف بھی نہیں، خود انھوں نے اپنے کارناموں اور کارگزاریوں پر شاید ہی کبھی فخر کیا ہو، اور انکی زبان پر خودستائی کا کوئی حرف آیا ہو، مگر انکی زبانِ حال سے سننے والے سن سکتے تھے کہ ان کا حال، قال سے اور ان کا عمل ان کے علم سے کہیں بڑھا ہوا تھا ؎

تا دسترسم بود زدم چاکِ گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

✻✻✻✻✻✻

حضرت مولانا قاری محمد توفیق احمد باندوی

ایک مردِ مومن اور فرشتہ صفت انسان

از: مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری — استاذ حدیث وتفسیر دار العلوم الاسلامیہ بستی

؎ فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

تواضع، مسکنت، بے نفسی، صبر، بردباری، ہمدردی اور غمخواری چمن انسانیت کے وہ پودے ہیں جنکی آبیاری خونِ جگر سے ہوتی ہے، ایک متواضع، بے نفس اور بردبار وغمخوار انسان کو نہ جانے کتنی جگہ کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں، اور نہ جانے کتنی بار پتے کو پانی کرنا پڑتا ہے، قدم قدم پر نفس کو لگام لگانا، اور ہر مرحلہ پر خواہشات کے طوفان کو دبانا انتہائی بے جگری کی بات ہے۔

؎ نہنگ واژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا!
بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گر مارا!

ان اوصاف کے ساتھ ساتھ اگر کوئی شخص عبادت و ریاضت تعلیم و تعلّم تذکیر و تزکیہ اور خدمتِ خلق میں پوری طرح سرگرم عمل ہو تو اسکو مجموعۂ اضداد ہی کہا جائے گا، یہ حیرت انگیز جامعیت توفیق الٰہی کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتی، بعض نفوسِ قدسیہ

کو فیاض ازل کی طرف سے ایسی طبیعت عطا کی جاتی ہے کہ انھیں کسی صورت قرار نہیں آتا، ہر کام کو کر ڈالنے کی خواہش اور ہر نیکی میں حصہ لینے کی آرزو ان کے دل میں موجیں مارتی رہتی ہے، بہت کچھ کر ڈالنے کے باوجود ان کا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ نہیں کیا، وہ مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ وَمَاعَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ کا مظہر ہوتے ہیں، انکی بیقرار اور بے چین طبیعت کو دیکھ کر ان سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ:

شررو برق نہیں شعلۂ و سیماب نہیں
کس لئے پھر تو ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

علامہ اقبالؒ اپنے دور کے قلندر تھے، اور قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید انھوں نے دیکھ کر ہی کہا ہوگا کہ جن کے سینے محبت الٰہی سے سرشار ہوتے ہیں، ان میں بجلی کی سی تڑپ اور حور کی سی پاکیزگی ہوتی ہے، وہ مسیحا نفسی کے حامل ہوتے ہیں، انکے اندر رب العزت کی شان بے نیازی کی جھلک ہوتی ہے، وہ فرشتوں کی سی عاجزی کی صفت سے آراستہ ہوتے ہیں، جہاں یہ اوصاف یکجا دکھائی دیں وہاں یقین کر لیجئے کہ محبت کی چنگاری سلگ رہی ہے ۔

تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی ، حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی : ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزاء کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں : مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جنکی شان یہ ہوتی ہے " لَا يَحْسُدُ الْاَخْيَارَ وَلَا يَعِيْبُ الْاَشْرَارَ" وہ اخیار سے حسد نہیں کرتے، اور اشرار کی عیب جوئی نہیں کرتے وہ " اَبْصَرُ النَّاسِ مَنْ كَانَ بِعُيُوْبِهِ بَصِيْرًا وَعَنْ عُيُوْبِ غَيْرِهِ ضَرِيْرًا " بینا وہ ہے جسکی آنکھیں اپنے عیوب پر کھلی ہوئی ہوں، اور دوسرے کے عیوب کی طرف سے بند ہوں" کا مصداق ہوتے ہیں، گویا وہ اپنی زبان حال سے یہ

کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر — رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر — تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

میں نے صفات کے ذکر کرنے میں درازنفسی سے کام لیا ہے اور موصوف کو متعین نہیں کیا ہے لیکن مجھے اطمینان ہے کہ ناظرین نے موصوف کو خود متعین کرلیا ہوگا، ہمارے ممدوح کی یہ صفات ان کا علم بن گئی تھیں، سراپا تواضع، مجسّم بےنفسی، عبادت و ریاضت کا پیکر حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ سے بڑھ کر کس کو دیکھا گیا ہے؟ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی خاک کس نے چھانی؟ امت کیلئے اس درجہ بیقرار کون رہا جیسے آتش زیرپا انسان بیقرار رہتا ہے، کس کی وفات کی خبر سن کر اہل سخن نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ برجستہ جگر کا یہ شعر دہرایا؟

؎ جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر — عمر بھر کی بیقراری کو قرار آہی گیا

اے خلد آشیاں صدیقؒ! آپ تو اپنے وقت کے داؤد طائیؒ تھے جنکی وفات پر اس زمانہ کے ایک اہل دل ادیب ابن السماک نے آبدیدہ ہوکر لکھا تھا:

جَاوَزْتَ حَدَّ الْمُسَافِرِيْنَ فِي أَسْفَارِهِمْ وَجَاوَزْتَ حَدَّ الْمَسْجُوْنِيْنَ فِي سُجُوْنِهِمْ أَمَّا الْمُسَافِرُوْنَ فَيَحْمِلُوْنَ مِنَ الطَّعَامِ وَالْحَلَاوَةِ مَا يَأْكُلُوْنَ فَأَمَّا أَنْتَ فَإِنَّمَا هِيَ خُبْزَتُكَ أَوْ خُبْزَتَانِ تَرْمِيْ بِهَا فِيْ دَنٍّ عِنْدَكَ فَإِذَا أَفْطَرْتَ أَخَذْتَ مِنْهَا حَاجَتَكَ فَجَعَلْتَهُ فِيْ مِطْهَرَتِكَ ثُمَّ صَبَبْتَ عَلَيْهِ مِنَ الْمَاءِ مَا يَكْفِيْكَ ثُمَّ اصْطَبَغْتَ بِهِ مِلْحًا فَهٰذَا إِدَامُكَ وَحَلْوَاكَ فَمَنْ سَمِعَ بِمِثْلِكَ صَبَرَ صَبْرَكَ أَوْ عَزَمَ عَزْمَكَ وَأَمَّا الْمَسْجُوْنُ فَيَكُوْنُ مَعَ النَّاسِ مَحْبُوْسًا فَيَأْنَسُ بِهِمْ وَأَنْتَ فَسَجَنْتَ نَفْسَكَ فِيْ بَيْتِكَ وَحْدَكَ فَلَا مُحَدِّثَ وَلَا جَلِيْسَ مَعَكَ، وَلَا سِتْرَ عَلٰى بَابِكَ وَلَا فِرَاشَ تَحْتَكَ وَلَا قُلَّةَ يَبْرُدُ فِيْهَا مَاءُكَ، وَلَا قَصْعَةَ يَكُوْنُ فِيْهَا غَدَاءُكَ وَعَشَاءُكَ،

مِطْهَرَتُكَ قُلَّتُكَ، وَقَصْعَتُكَ تَوْرُكَ"

"مسافر بھی اپنے سفر میں کھانے کی نمکین اور میٹھی چیزیں رکھ لیتے ہیں، جو زادِ راہ کے طور پر کام آتی ہیں، لیکن آپ مسافروں سے بھی آگے بڑھ گئے، آپ کا تمامتر توشہ بس وہی ایک دو روٹیاں ہوتی تھیں جنکو اپنے پاس رکھے ہوئے گھڑے میں ڈالدیتے تھے، پھر جب آپکو کھانا ہوتا تھا تو اس سے بقدر ضرورت لیکر اپنے لوٹے میں ڈالدیتے تھے، اور اوپر سے پانی ڈال کر نمک ملا دیتے تھے بس یہی آپ کا سالن تھا اور یہی آپ کا حلوا تھا، آپ جیسا صبر کس نے کیا؟ اور آپ جیسی عزیمت کس نے دکھائی؟ قیدی دوسروں کیساتھ قید ہوتا ہے اور ان سے جی بہلا لیتا ہے، لیکن آپ نے خلوت گزینی میں قیدیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا آپ جب اپنے حجرہ میں تخلیہ کرتے تھے تو نہ کوئی ہمنشیں ہوتا تھا نہ کوئی غمخوار، نہ آپ کے دروازے پر کوئی پردہ تھا، نہ آپ کے نیچے کوئی گدا، نہ کوئی مٹکا تھا جس میں آپ کیلئے پانی ٹھنڈا کیا جاتا، نہ کوئی ناشتہ دان تھا جس میں آپ کا صبح و شام کا کھانا رکھا رہتا، آپ کا لوٹا ہی آپ کا مٹکا تھا، اور آپ کا پیالہ آپ کا ناشتہ دان تھا"۔

اے صدیق محترم! کیا آپ کو ٹھنڈا پانی مرغوب نہیں تھا، کیا عمدہ لباس کا آپکو شوق نہیں تھا، اور کیا لذیذ کھانوں کی طرف آپکی طبیعت کا میلان نہیں تھا؟ کیوں نہیں ہر شخص کے اندر اس طرح کی رغبت ہوتی ہے، اور ہر انسان کی طبیعت میں یہ میلان پایا جاتا ہے، لیکن آپ نے اپنی آخرت کیلئے ان چیزوں سے اجتناب کیا، تو کس قدر عظیم تھی وہ چیز جسکو آپ نے پیش نظر رکھا، اور اسکے مقابلہ میں کس قدر حقیر تھیں وہ چیزیں جنکو آپ نے ترک فرمایا، آپکو دیکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ حال کی کلفت اٹھا کر آپ مآل کی سعادت سے ہمکنار ہوئے، آپ

نے عمر بھر شہرت سے پرہیز کیا، مگر آپ کے رب نے آپکو اتنی شہرت عطا کی کہ اگر آپ اس ہجوم کو دیکھ لیتے جو آپ کے جنازہ کے پیچھے چل رہا تھا تو آپکو اندازہ ہو جاتا کہ آپ کی صلاح و فلاح کی سعادت دینے والوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے "مَا اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ خَيْرًا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ" تم جس کا ذکر خیر کیساتھ کرو اس کے لئے جنت ثابت ہے "مَارَآهُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ" اہل ایمان کی جماعت جسے اچھا سمجھے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔

؎ بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو ٭ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

جسکی صورت اسکی معصومیت کی گواہی دے، اور جس کی سرخ اور آبدیدہ آنکھیں اسکی شب بیداری اور خدا ترسی کی شہادت پیش کریں اسیر باہر سے شہادت لانے کی ضرورت کیا ہے ؎ خورشید کو کچھ حاجت زیور نہیں زنہار

پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار

ہر دور میں کچھ برگزیدہ ہستیاں اُس دور کیلئے انسانیت اور شرافت کا معیار ہوتی ہیں جنکو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ انسانوں کو کتنی بلندی پر ہونا چاہئے یا عام انسان کتنی پستی تک آ گئے ہیں جب سڑکوں کی پٹائی ہوتی ہے، تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ سڑک کے دائیں اور بائیں سے مٹی کھود کر سڑک پر ڈالی جاتی ہے، مٹی کھودنے والے مزدور جتنے مربع میں مٹی کھودتے ہیں اسکے بیچوں بیچ مٹی کا ایک ستون چھوڑ دیتے ہیں، وہ ستون یہ متعین کرتا ہے کہ کھدائی کتنی ہوئی، اور مٹی کتنے نشیب تک نکالی گئی، ٹھیک اسی طرح اُن برگزیدہ اور معیاری شخصیتوں کو دیکھ کر ہم کو اپنی پستی کا اندازہ ہوتا ہے، جب ایسی شخصیتیں اٹھ جاتی ہیں تو گویا انسانیت کی زندہ میزان اٹھ جاتی ہے۔

حضرت ممدوح کی خاکساری اور مساوات پسندی کا ایک تجربہ ناچیز کو بھی

ہوا، دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کی فراہمی سرمایہ کیلئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ نے ناچیز اور مفتی ظفیر الدین صاحب مرتب فتاوی دارالعلوم کو ۱۹۸۰ء میں حضرت باندوی کی خدمت میں بھیجا اور ایک مکتوب عنایت فرمایا جسمیں حضرت باندوی سے استدعا کی گئی تھی کہ لکھنؤ میں اپنے متعلقین کو اس جانب متوجہ فرمادیں، حضرت باندوی بلا تکلف اس کام کیلئے تھوڑا سے لکھنؤ کیلئے ہم خدام کے ہمراہ روانہ ہوگئے، جبکہ حضرت نے کبھی بھی اپنے ادارہ کیلئے اس طرح کی تحریک نہیں کی، اس باب میں حضرت بہت محتاط اور حساس واقع ہوئے تھے، یہ تو دارالعلوم کی عظمت اور حکیم الاسلام کی شخصیت کا کرشمہ تھا، ہم لوگ باندہ میں روڈویز بس پر سوار ہوئے جو لکھنؤ جارہی تھی، بس میں صرف ایک سیٹ خالی تھی، بس میں جب حضرت نے قدم رکھا تو پوری بس میں ہلچل پڑ گئی، کنڈکٹر، ڈرائیور اور سواریاں کہنے لگیں "بابا آگئے، بابا آگئے" بہت سے لوگ اپنی سیٹوں سے اٹھ گئے کہ بابا یہاں تشریف لائیے، یہاں بیٹھئے، لیکن حضرت کو صرف ہم دونوں کی فکر تھی چنانچہ خالی سیٹ پر ہم دونوں کو باصرار بٹھا دیا گیا، اور کنڈکٹر نے ایک سواری کو اسکی سیٹ سے اٹھا کر حضرت کیلئے سیٹ خالی کروالی، جب حضرت سے اس سیٹ پر بیٹھنے کی درخواست کی گئی، تو حضرت نے اس پر بیٹھنے سے سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ اس سیٹ پر اسی شخص کو بیٹھنے کا حق ہے جو پہلے سے بیٹھا ہوا ہے یہ کہتے ہوئے حضرت نے اسٹینڈنگ میں اپنی چادر بچھا دی، اور نیچے بیٹھ گئے یہ منظر دیکھ کر ڈرائیور نے جو غیر مسلم تھا گاڑی روکدی، اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ: بابا مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ آپ نیچے بیٹھے ہوں، اور میں سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی چلاؤں" "بابا نے فرمایا میں بس سے اتر تو سکتا ہوں، لیکن کسی کو اٹھا کر اس کی سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتا" جب ڈرائیور اور کنڈکٹر ہر طرح کے اصرار اور خوشامد میں ناکام

ہو گئے تو انھیں مجبوراً گاڑی چلانی پڑی، بس کوئی آدھ گھنٹہ چلی ہوگی کہ راستہ میں آر، ٹی، او نے چیکنگ کیلئے بس روکی، کنڈکٹر نے آر، ٹی او سے چپکے سے کہا کہ بس میں بابا بیٹھے ہوئے ہیں، ذرا جلدی چیک کر لیجئے، اس علاقہ میں حضرت کو غیر مسلم "بابا" کے نام سے یاد کرتے تھے ان کے یہاں اس لفظ کے معنی ہیں خدا رسیدہ اور زاہد و مرتاض شخصیت، آر، ٹی، او نے کہا بہتر ہے، بابا کو دیر نہ ہونی چاہیے، بس اسٹارٹ کرو، ہم بس میں بیٹھ کر چلتے چلتے چیک کر لیں گے اور اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے آر ٹی او جب بس میں سوار ہوا اور کنڈکٹر نے اپنی سیٹ پر اس کو بٹھایا تو اس نے پوچھا بابا کہاں بیٹھے ہیں، جب اس نے دیکھا کہ حضرت اسٹینڈنگ میں نیچے بیٹھے ہوئے ہیں تو اس نے کنڈکٹر کو ڈانٹنا شروع کیا کہ تو نے بابا کو نیچے بٹھا رکھا ہے، پھر بڑی لجاجت سے عرض کیا کہ بابا سیٹ پر بیٹھ جائیے ورنہ میں سیٹ پر نہیں بیٹھوں گا، حضرت نے فرمایا "میں یہی چاہتا ہوں کہ کسی کو اٹھا کر نہ میں بیٹھوں نہ آپ بیٹھیں، بالآخر آر، ٹی، او نے کھڑے کھڑے چیکنگ کی، اور اگلے اسٹیشن پر اتر گیا، وہاں دوسری سواریاں بھی اتریں اور سیٹیں خالی ہوئیں اسوقت حضرت سیٹ پر تشریف فرما ہوئے، یہ ذرا سی بات تھی لیکن اسکا اتنا اثر ہوا کہ راستہ بھر سواریوں میں یہ باتیں ہوتی رہیں کہ انصاف اسکو کہتے ہیں، اور اللہ والے ایسے ہوتے ہیں۔

باندہ سے سوار ہو کر ہم لوگ ۱۱ بجے شب میں لکھنؤ پہونچے اور یہاں، ایک رفیق سفر کا ذکر کرنا میں بھول گیا، وہ ہیں جھانسی کے مولانا محمد اسحاق صاحب قاسمی جو ہمارے ساتھ تھے، حضرت نے ایک ہوٹل کے پاس رکشہ رکوا کر مولانا محمد اسحاق صاحب سے فرمایا کہ روٹیاں یہاں سے خرید لو، پھر جہاں ٹھہریں گے وہاں چٹنی وغیرہ پسوالیں گے، اس طرح کام چل جائے گا، اگر

رات کو روٹیاں پکانی پڑیں تو گھر والوں کو بڑی زحمت ہوگی، مولانا اسحاق صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا کہ حضرت کیساتھ انشاء اللہ بریانی ہی ملیگی، حضرت کا حکم ہے اس لئے روٹیاں لیے لیتے ہیں، جب ان صاحب کے یہاں پہونچے جہاں قیام کرنا تھا، تو معلوم ہوا کہ صاحب خانہ کے بہت قریبی رشتہ دار کی آج شادی ہے، جب انکو معلوم ہوا کہ حضرت تشریف لائے ہیں تو انواع واقسام کے کھانے کافی مقدار میں بھجوا دئیے، ان کھانوں میں بریانی بھی تھی، اس طرح مولانا اسحاق صاحب کی قلندرانہ پیشین گوئی پوری ہوکر رہی۔

عشاء کی نماز پڑھنے اور کھانا کھانے میں رات کا ایک بج گیا، ہم لوگ آپس میں یہ کہہ رہے تھے کہ سردی کا موسم ہے، اور حضرت دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں اور رات کی دو تہائیاں گذر چکی ہیں، آج کی شب حضرت کا تہجد کیلئے اٹھنا دشوار ہے، مگر واہ رے اللہ کے عاشق! ایسے چوکنے ہوکر سوئے جیسے پرندہ ڈال پر سوتا ہے، جیسے ہی تہجد کا وقت آیا کھٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت رازداری سے غسل خانہ کا دروازہ کھولا، اور انتہائی خاموشی سے وضو کیا اور اپنے رب سے مناجات میں مشغول ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کی جو صفتیں بیان کی ہیں، ہمارا ممدوح انکی سچی تصویر تھا، جب وہ چلتے پھرتے تھے تو وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا کی تفسیر کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے، اور جب ذرا سی جھپکی لیکر تہجد میں مشغول ہوجاتے تھے تو وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا کی تفسیر نظر آتے تھے، ذکر الٰہی کرتے ہوئے لب، خشیت سے جھکی ہوئی آنکھیں اور معرفت ربانی سے مسکراتا ہوا چہرا اب کہاں دیکھنا نصیب ہوگا، جو مدارس کی گرمی محفل تھے وہ چلے گئے، جنکو دیکھتے ہی مسجدیں کھچا کھچ بھر جاتی تھیں وہ

رخصت ہو گئے جنکی مجلس میں بیٹھنے والا خود کو مالا مال سمجھتا تھا۔ اور جن کے قریب جگہ پانے والا پھولے نہیں سماتا تھا، وہ ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئے، نہ جانے کتنی مرتبہ انکے پاس بیٹھ کر یہ شعر گنگنایا گیا ہے

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

دینداری کا معیار

آجکل لوگوں نے دینداری کا معیار یہ سمجھ رکھا ہے کہ عبا، کرتہ، پائجامہ سفید، ہاتھ میں تسبیح اور الّا اللّٰہ کی ضربیں، بس یہ ہے بڑی دینداری، چاہے دل میں کینہ، بغض بھرا ہو، کسی کی زمین دبائے بیٹھے ہوں، کسی کا حق دبائے ہوں، اور بنے ہیں دیندار لمبا کرتہ اور تسبیح گھمانے کا نام دینداری نہیں ہے، بلکہ دینداری یہ ہے کہ ہمارا دل صاف ہو، آپس میں ایک دوسرے کی ہمدردی اور محبت ہو، اور یہی علامت ہے نیک اور دین دار کی۔

(از:- عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ)

عارف باللہ صدیقِ دوراں

حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ

امتیازات و خصوصیات

(از: مولانا عتیق احمد قاسمی — استاذ حدیث و فقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مورخہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۷ء کو ایمان و عزیمت، اخلاص وللہیت، تواضع و بے نفسی، ایثار و قربانی، مجاہدہ و جہد مسلسل، اصلاح و دعوت کا ایک عظیم پیکر اس جہانِ فانی سے عالم جاوداں کی طرف رخصت ہو گیا، اور اپنے لاکھوں شاگردوں، مریدوں اور نیازمندوں کو سوگوار چھوڑ گیا، وہ مسیحا صفت شخصیت ہم سے رخصت ہو گئی، جو اپنے بے شمار امراض و اعذار کے باوجود بے شمار انسانوں کے زخموں کا مرہم اور لاکھوں شکستہ دلوں کیلئے باعثِ طمانیت تھی وہ زار و نزار مبارک وجود ہمارے درمیان سے اٹھ گیا جو ملت اسلامیہ کے درد کا درماں اور پریشان حال انسانیت کے غموں کا مداوا تھا۔ حضرت مولانا صدیق احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت ایک خاندان، ایک علاقہ یا ادارہ کا سانحہ نہیں ہے، بلکہ پوری ملت اسلامیہ اور سارے عالم انسانیت کا عظیم ترین سانحہ ہے، موت کی آغوش میں پہنچ کر انکی عمر بھر کی بیقراری کو قرار ضرور آ گیا، لیکن پوری دنیا کو وہ بیقرار کر گئے

خصوصاً اسلامیانِ ہند میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

حضرت قاری صدیق صاحبؒ پر اخبار و رسائل نے کافی لکھا، بعض جرائد نے خاص نمبر بھی شائع کئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ پر ابھی بہت کچھ لکھے جانے کی ضرورت ہے، انکی خدمات اور کارناموں کے بہت سے گوشے اب بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں، انکی سیرت و اخلاق کے آبدار موتی نئی نسلوں کے سامنے بار بار پیش کئے جانے چاہئیں تاکہ انکی سیرت و اخلاق کا عکس جمیل نئی نسل میں منتقل ہو۔

یہ تو یاد نہیں کہ حضرت قاری صدیق صاحبؒ کا ذکر پہلی بار کب سنا، اور کس کی زبان سے سنا، لیکن حضرت قاری صاحب کی پہلی زیارت اب بھی اچھی طرح یاد ہے ۱۹۶۸ء ۱۹۶۹ء کی بات ہوگی، میں مدرسہ نور العلوم بہرائچ میں زیر تعلیم تھا، ایک بزرگ جناب مولانا کلیم اللہ نوری نائب مہتمم مدرسہ نور العلوم بہرائچ کے پاس تشریف لائے، مولانا کلیم اللہ صاحب اور مدرسہ کے اساتذہ ان سے بہت احترام اور تپاک سے ملے، اور انکی تشریف آوری کا معقول بندوبست کرنے لگے، وہ بزرگ پوری سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ مدرسہ کی چھت پر جہاں کوئی فرش بھی بچھا ہوا نہیں تھا، سفید اور صاف شفاف لباس کے ساتھ بیٹھ گئے، جناب مولانا کلیم اللہ صاحب اصرار فرماتے رہے کہ فرش یا چٹائی بچھا دیں، اس پر تشریف رکھیں، لیکن انھوں نے فرمایا کہ چھت بالکل صاف ستھری ہے، کوئی فرش، چٹائی بچھانے کی ضرورت نہیں ہے، وہیں بیٹھے ہوئے چند منٹ بات چیت کی، مدرسہ نور العلوم کے رجسٹروں وغیرہ کے بارے میں کچھ معلومات نوٹ کیں اور پھر جلد ہی رخصت ہو گئے، غالباً انھیں اپنے مدرسہ کیلئے کچھ رجسٹر اور کاغذات چھپوانے تھے اس کیلئے نمونۃً مدرسہ نور العلوم کے رجسٹر اور

دفتری کاغذات دیکھ رہے تھے، کسی نے بتایا کہ یہ بزرگ حضرت مولانا صدیق احمد باندوی ہیں، بڑے متقی اور خدا رسیدہ انسان ہیں، باندہ ضلع میں انکا ایک بڑا عربی مدرسہ ہے، مولانا مرحوم کی سادگی، بے تکلفی اور معصومیت نے اپنا گرویدہ بنالیا، مولانا باندوی کی عقیدت، محبت وعظمت کا تخم دل میں پڑ گیا جس نے امتداد زمانہ کے ساتھ تناور درخت کی شکل اختیار کرلی۔

۱۹۷۰ء میں تعلیم مکمل کرنے کیلئے عالم اسلام کی مشہور دانشگاہ دارالعلوم دیوبند میں حاضری ہوئی، ابتدائی ایام ہی میں جن طلبہ سے شناسائی ہوئی ان میں ایسے متعدد طلبہ میخانہ صدق وصفا کے جرعہ نوش تھے یعنی حضرت مولانا قاری صدیق صاحبؒ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند حاضر ہوئے تھے برادر مکرم جناب مولانا عبید اللہ الاسعدی (استاذ حدیث جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ) بھی انھیں خوش نصیب طلبہ میں سے تھے، انکے علاوہ مولانا شبیر مظفر پوری مولانا محمد احمد ہمیر پوری، مولانا عاشق رائے بریلوی کے نام بھی یاد آرہے ہیں، یہ حضرات آپس میں جب بھی ملتے حضرت قاری صاحبؒ کا تذکرہ بڑی گرویدگی، محبت اور احترام کے ساتھ کرتے، قاری صاحب کی شفقت ومحبت حسن اخلاق، اخلاص وتواضع کے ذکر سے انکی کوئی مجلس مشکل سے خالی جاتی ہوگی، عام طور پر طلبہ کو مدارس کے منتظمین، ارباب اہتمام سے کچھ نہ کچھ شکایتیں ہی رہتی ہیں، لیکن قاری صدیق صاحبؒ عجیب قسم کے ناظم اور منتظم تھے انکے مدرسہ کا پڑھا ہوا ہر طالب علم ان کا شیدائی اور گرویدہ نظر آیا، واقعہ یہ ہے کہ قاری صاحب طلبہ کے ساتھ حد درجہ شفقت ومحبت کا برتاؤ کرتے تھے، مدرسہ کے طلبہ کی راحت وآرام کا خیال خود اپنے بال بچوں سے کہیں زیادہ کرتے تھے، ان کی بیماری اور بے آرامی سے تڑپ اٹھتے تھے، اور

علاج و معالجہ کا ہر ممکن بند و بست کرتے، حضرت قاری صاحبؒ کی طرف سے طلبہ کی خدمت، راحت رسانی، اور ان پر غیر معمولی شفقت کے بیشمار واقعات انکے مدرسے کے اساتذہ اور طلبہ سے اس کثرت اور تواتر کیساتھ سنے ہیں کہ انکی صداقت میں ادنیٰ شبہ باقی نہیں ہے، اس ہمدردانہ اور مشفقانہ برتاؤ کے بعد طلبہ کا انکی شان میں رطب اللسان رہنا ایک فطری بات تھی۔

ان سب پر مستزاد حضرت قاری صاحبؒ کی مجاہدانہ اور زاہدانہ زندگی تھی حضرت قاری بلا شبہ اپنے طرز زندگی میں اسلاف کا بہترین نمونہ تھے، انکی ابتدائی زندگی بہت فقر و فاقہ اور آزمائش کی تھی، دور طالب علمی میں اور اس کے بعد انتہائی عسرت کی زندگی گذاری، بہت پامردی اور استقامت کے ساتھ اپنا علمی و دینی سفر جاری رکھا، ان کا زہد و قناعت، اخلاص و بے لوثی، انکساری و تواضع، ریاضت و مجاہدہ دیکھ کر طلبہ ان پر فریفتہ اور گرویدہ تھے، اور انکی عظمت و عقیدت اور محبت سے طلبہ اور اساتذہ کے دل معمور بلکہ مخمور تھے، اس لئے مدرسہ عربیہ ہتھورا باندہ کے طلبہ اور مستفیدین کی حضرت قاری صاحبؒ سے حد درجہ عقیدت و گرویدگی ایک فطری بات تھی، لیکن مجھے چونکہ دارالعلوم دیوبند پہنچنے تک حضرت قاری صاحبؒ کی شخصیت کا پورا عرفان نہیں تھا، اس لئے ان کے ساتھ ان کے طلبہ کی محبت و عقیدت دیکھ کر خاصا تعجب ہوا، اور شبہ ہوا، کہ شاید یہ لوگ عقیدت کے بارے میں غلو کا شکار ہیں، لیکن بعد کے علم و واقفیت نے یہ شبہ دور کر دیا۔

دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث اور افتاء کی تکمیل کے بعد ایک ایک سال دارالعلوم محمدیہ میل کھیڑلا (میوات) اور مدرسہ ہدایت العلوم کرہی ضلع بستی سے تدریسی خدمات کیلئے وابستہ رہا، اس کے بعد تین سال مدرسہ امدادیہ

مرادآباد سے وابستگی رہی، مرادآباد کے تین سالہ زمانۂ قیام میں حضرت قاری صدیق احمد صاحبؒ سے بار بار ملاقات اور زیارت کا شرف حاصل ہوا، انھیں نسبتہً کچھ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، حضرت قاری صاحبؒ ایک سے زائد بار مرادآباد تشریف لائے، مدرسہ امدادیہ میں قیام فرمایا، ایک بار میں خود بھی حضرت کی خدمت میں ہتھورا باندہ حاضر ہوا، حضرت قاری صاحب کا نورانی چہرہ ان کی عبادت وریاضت کی غمازی کرتا تھا، روشن، خمار آلودہ نگاہیں شب زندہ داری کی شہادت دیتی تھیں، انکی شخصیت میں عجیب قسم کی مقناطیسیت اور کشش تھی، دل بلکہ پورا انسانی وجود بے اختیار انکی طرف کھنچتا تھا، محسوس ہوتا تھا گویا کوئی فرشتہ آسمان سے اتر آیا ہے۔

پہلی بار حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کی نیت سے کانپور پہونچا معلوم ہوا کہ حضرت قاری صاحبؒ کا آج رات میں کانپور ہی میں پروگرام ہے، ایک جلسہ میں شرکت فرمائیں گے، اور رات میں کانپور میں قیام فرمائیں گے، حضرت قاری صاحبؒ کی تشریف آوری ہوئی، تو حاضر خدمت ہوا، بہت مسرت کا اظہار فرمایا، اور اپنے ساتھ رکھا، عشاء کے بعد جلسہ تھا، جلسہ میں کافی تاخیر ہوئی، پروگرام ختم ہوتے ہوتے رات کے ایک بج گئے، گرمیوں کی مختصر رات تھی جلسہ ختم ہونے کے بعد تعویذ لینے والوں، اور پانی پر دم کرانے والوں کی بھیڑ لگ گئی، حضرت قاری صاحبؒ نے مجھے اور بعض دوسرے مہمانوں کو مسجد کے حجرہ میں آرام کرنے کیلئے فرمایا، اور خود لوگوں کے ہجوم میں مسجد کے صحن میں بیٹھ گئے، میں تو تھکا ماندہ تھا سو گیا، حضرت قاری صاحبؒ کو خدا جانے کب اس بھیڑ سے فرصت ملی، اور کب بستر پر لیٹے، صبح صادق سے کچھ پہلے چار بجے کے آس پاس آنکھ کھلی تو حضرت قاری صاحبؒ کو نماز تہجد میں مشغول پایا، اس وقت تو تعجب ہوا، لیکن بعد میں

معلوم ہوا کہ ایسا قاری صاحبؒ کیلئے کوئی نئی بات نہیں ہے سحر خیزی بلکہ شب خیزی کی عادت ہے خواہ کتنی ہی تاخیر سے سوئے ہوں نماز تہجد نہیں چھوٹتی اور رات کے پچھلے پہر کے سناٹے میں رب کی بارگاہ میں سجدۂ نیاز سے نہیں چوکتے۔

صبح سویرے حضرت قاری صاحبؒ کی معیت میں پسنجر ٹرین سے باندہ جانا تھا صبح ہوتے ہی فجر کے بعد قاری صاحب کو ہماری چائے ناشتے کی فکر ہوئی، پر تکلف ناشتہ کرا کے وہ ہمیں لیکر اسٹیشن پہونچے، وہاں بھی اچھے خاصے لوگ انتظار میں تھے، کوئی دعا کرانے آیا تھا، کوئی تعویذ لینے آئے، حضرت قاری صاحبؒ نے جلدی جلدی ان سب کا کام نمٹایا، گاڑی باندہ کیلئے روانہ ہو گئی، ہر اسٹیشن پر کچھ لوگ حضرت قاری صاحبؒ کے انتظار میں ملتے، بعض حضرات ناشتہ کا سامان بھی ساتھ لائے، ریلوے کا عملہ بھی عقیدت سے انھیں سلام کرتا، اور قاری صاحبؒ کو سفر میں ہمسفر مہمانوں کی راحت رسانی اور ضیافت کا فکر دامن گیر تھا، ایک اسٹیشن پر حضرت قاری صاحبؒ پلیٹ فارم پر اترے، اور کھانے پینے کا کچھ سامان خرید کر ہم لوگوں کیلئے لائے، مہمانوں کے ساتھ حضرت قاری صاحبؒ کا یہ رویہ انکی طبیعت ثانیہ بن چکا تھا، انکے یہاں بہت کثرت سے مہمان آیا کرتے تھے آنے والوں میں ہر مسلک و مذہب اور ہر طبقے کے لوگ ہوا کرتے تھے، انکے یہاں حسب مراتب تمام مہمانوں کا اکرام کیا جاتا تھا، اس کثرت سے مہمانوں کی آمد کے باوجود کسی کو بے توجہی کی شکایت نہیں ہوتی تھی، مہمانوں کی راحت رسانی کیلئے قاری صاحبؒ نے اپنا سب کچھ قربان کر رکھا تھا اتنے کثیر مہمانوں کے اکرام وضیافت سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس کے پیش نظر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہو "مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ" (جو شخص اللہ اور اسکے رسول پر ایمان رکھتا ہو اسکو چاہئے کہ اپنے

مہمان کا اکرام کرتے)

مدرسہ پہونچے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، کورذہ علاقہ اور پسماندہ گاؤں میں تنہا ایک شخص کے اخلاص و عزم کی بدولت اسلام کا اتنا عظیم قلعہ کھڑا تھا، پوری فضا کتاب و سنت اور اسلامی علوم کے زمزموں سے گونج رہی تھی، اساتذہ و طلبہ اسلامی اخلاق و کردار کے نمونے تھے، مدرسہ میں حضرت قاری صاحبؒ کی مصروفیت دیکھنے کے قابل تھی، زندگی کا ایک ایک لمحہ وصول کیا جا رہا تھا، اتنے کثیر اور متنوع کام اپنے سر پر اوڑھ لئے تھے جن کی انجام دہی ایک جماعت کیلئے مشکل تھی، ہمارے کرم فرما اور دوست جناب مولانا عبید اللہ الاسعدی صاحب بھی مدرسہ میں استاذ تھے، انھوں نے بھی حسب توقع اکرام و ضیافت کی حد کردی غالباً دو روز مدرسہ میں رہا لیکن حضرت قاری صاحب کی شفقت و عنایت اور اساتذہ مدرسہ کی محبت کی وجہ سے دو روز دو ساعت کی طرح گذر گئے۔

مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں تین سال قیام کے بعد ۱۹۸۱ء کے اواخر میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء سے منسلک ہوگیا، ندوۃ میں تقریباً اٹھارہ سال ہونے کو ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ عالمی شہرت کا حامل مرکزی ادارہ ہے حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم کی نظامت و قیادت نے اس ادارہ کی عزت و شہرت کو چار چاند لگائے ہیں، لکھنؤ اتر پردیش کا مرکز اور قلب و جگر ہے، باندہ سے اس کی دوری بھی بہت زیادہ نہیں اسلئے لکھنؤ میں حضرت قاری صدیق صاحبؒ کی آمد بار بار ہوا کرتی تھی، یہاں آنے کے بعد حضرت قاری صاحبؒ کو بار بار قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انکے رفیق درس اور جگری دوست حضرت مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نقویؒ (ناظر کتبخانہ ندوۃ العلماء)

رہا کرتے تھے، یہ ممکن نہیں تھا کہ حضرت قاری صاحبؒ لکھنؤ تشریف لائیں، اور ان سے ملاقات نہ کریں، حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم جب ندوہ میں قیام پذیر ہوتے، تو قاری صاحب انکی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے خواہ تھوڑی دیر ہی کیلئے سہی، اور انکی خدمت میں اسقدر مودّب بیٹھتے جس طرح کوئی ادنیٰ مرید پیر کی خدمت بیٹھتا ہے، حالانکہ حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم انکے ساتھ حد درجہ اکرام و محبّت کا معاملہ فرماتے تھے، حضرت قاری صاحب کی زندگی میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اسوقت کے دو بزرگوں سے بہت تعلق اور مناسبت ہے، ایک حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ دوسرے مولانا قاری صدیق احمد صاحبؒ۔

میرے اٹھارہ سالہ قیام لکھنؤ میں شہر لکھنؤ میں انکی شہرت و مقبولیت تیزی کیساتھ بڑھتی چلی گئی، جو ان سے ایک بار قریب ہوا قریب ہوتا چلا گیا، کسی کے بارے میں ایسا نہیں سنا کہ ان سے قریب ہو کر دور گیا ہو، انکی زندگی کے آخری چند سالوں میں انکی شہرت و مقبولیت اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ گئی، وہ جہاں ہوتے خلق خدا کی بھیڑ لگ جاتی، لیکن ان کے گرد بھیڑ لگانے والے عمومی طور پر کسی اصول اور ضابطہ کے پابند نہ تھے، اور وقت بے وقت حضرت قاری صاحبؒ کو بے آرامی پہنچاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ انکی صحت گرتی چلی گئی، اور متعدد امراض میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت قاری صاحبؒ کے بارے میں اپنے تمام تأثرات و مشاہدات قلمبند کر دوں تو سلسلہ کافی دراز ہو جائے گا، اس لئے میں انکی اہم خصوصیات بیان کرنے پر اکتفا کر دوں گا، حضرت قاری صاحبؒ کی وفات سے چند منٹ پہلے سحر نرسنگ ہوم پہونچ گیا تھا، وفات کے بعد انکی نعش کو دیکھ کر

بار بار اقبال مرحوم کا یہ شعر یاد آرہا تھا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم!!
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

صد حیف کہ وہ خدا ترس، انسانیت نواز شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی، جس کے گھنیرے سائے میں بیشمار پریشان حال، ستم رسیدہ انسان اطمینان وسکون کا سانس لیتے تھے، اور جس کی شمع رشد وہدایت سے لاکھوں تیرہ وتاریک دل منور ہو اٹھے تھے، اگلے صفحات میں اسی شخصیت کی چند اہم خصوصیات زیب قرطاس کی جاتی ہیں۔

(۱) اخلاص وللہیت

ایک عالم ربانی داعی الی اللہ کی اصلی پونجی (راس المال) اخلاص وللہیت ہے، اخلاص وللہیت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اعمال کی قبولیت کی پہلی شرط ہے، اخلاص کے ساتھ تھوڑا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت شمار ہوتا ہے، اور ریا کاری بے اخلاصی کے ساتھ نیک اعمال کا پہاڑ بھی پرِ کاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، حضرت قاری صاحب کے یہاں اخلاص وللہیت کا سرمایہ بہت وافر مقدار میں موجود تھا، موصوف ریا ونمود، نمائش وشہرت طلبی، تشہیر واظہار سے کوسوں دور تھے، ان کا ہر عمل واقدام صرف اللہ کی رضا طلبی کیلئے تھا موصوف کو ایمان واحتساب کا وہ مقام بلند حاصل تھا جو خال خال ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے، حضرت قاری صاحبؒ کو تعلیم سے فراغت کے بعد شہرت اور ترقی کے وہ تمام مواقع حاصل تھے، جو ایک ہونہار، باصلاحیت، نوعمر عالم دین کو حاصل ہو سکتے تھے، آپ اساتذہ کے منظور نظر تھے مظاہر علوم سہارنپور کے ذمہ داران صلاحیت اور صلاح کی وجہ سے انکے بڑے

قدر داں تھے، لیکن انھوں نے ایک بڑے ادارے کی مدرسی پر اپنے علاقے کی اصلاح و سدھار کو ترجیح دی، اور اپنے اخلاص وللہیت، مجاہدہ و قربانی سے پورے علاقہ کی کایا پلٹ دی۔

(۲) اخلاق و تواضع حضرت قاری صدیق صاحبؒ، اخلاق و تواضع، بے نفسی اور فروتنی میں اپنی مثال آپ تھے ان کا اخلاق، اخلاق نبوی کا بہترین پرتو تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مومنوں میں سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے بہتر ہو" ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے: "بندہ اپنے حسن اخلاق سے اس شخص کا مقام حاصل کرلیتا ہے، جو پابندی سے روزہ رکھتا ہے، اور شب زندہ دار ہے" حضرت قاری صاحبؒ بلند اسلامی اخلاق کے زیور سے آراستہ تھے، ہر شخص سے انتہائی محبت اور خندہ روئی سے ملتے، ہر ملنے والے پر یہ تاثر ہوتا کہ قاری صاحبؒ اس سے بہت محبت اور تعلق رکھتے ہیں، مہمانوں کا حد درجہ اکرام فرماتے تھے، اپنے انتہائی مخالفین کے ساتھ بھی بڑا فراخ دلانہ برتاؤ فرماتے، مخالفین کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے، کہ وہ انکی مخالفانہ سرگرمیوں سے کچھ بھی واقف ہیں، موصوف نے اپنے اخلاق عالیہ سے بدترین دشمنوں کو زیر کیا، انکے دل جیت لئے، حضرت قاری صاحبؒ کی شدید ترین مخالفتیں بھی ہوئیں، اور ان کے خلاف شورشوں کا طوفان بھی کھڑا کیا گیا، لیکن موصوف کے بلند اسلامی اخلاق، بے نفسی اور تواضع نے مخالفت کو عقیدت اور محبت میں تبدیل کردیا، شدید ترین دشمن عقیدت مند اور عاشق زار ہو گئے، یہ سب انکے حسن اخلاق کا ادنی کرشمہ تھا

تواضع اور فروتنی انکی فطرت تھی، ان کے شیخ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ

کے بقول "وہ مادرزاد ولی تھے" حبِّ مال ہی نہیں بلکہ حبِّ جاہ سے بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں محفوظ رکھا تھا، زندگی بھر مال و دولت، جاہ و منصب سے گریزاں رہے، انھوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے اپنے کو صد درجہ پامال کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں عزت و شہرت کا بلند ترین مقام عطا فرمایا، حضرت قاری صاحبؒ کے یہاں اَنا کا مسئلہ سرے سے نہیں تھا، استغناء کے ساتھ فروتنی اور بے نفسی آخری درجہ کی تھی، اپنے ساتھیوں اور خوردوں کا اس قدر احترام کرتے، اور ان کے ساتھ اس قدر تواضع سے پیش آتے جتنا احترام اور تواضع کا معاملہ آجکل لوگ اپنے اساتذہ اور مشائخ کے ساتھ نہیں کرتے۔

(۴) تمام دینی کاموں کی حمایت و نصرت

حضرت قاری صدیق صاحبؒ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر دینی و ملّی کام کی حمایت و نصرت کرتے تھے، دینی و ملّی کام جس محاذ پر بھی ہو رہا ہو، اور جن لوگوں کے ذریعہ بھی ہو رہا ہو اسے حضرت قاری صاحبؒ کا تعاون اور دعائیں حاصل تھیں، آج کل مسلمانوں میں ایک مرض یہ پیدا ہو گیا ہے کہ جو شخص جس لائن سے دین و ملّت کی خدمت میں مصروف ہے، اسی کو وہ اہم اور مفید تصور کرتا ہے، دوسرے دینی و ملّی کاموں کی یا تو نفی کرتا ہے، یا انکی اہمیت و ضرورت گھٹا کر پیش کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف میدانوں کے خادمان دین و ملت میں چپقلش اور بے اعتمادی کا ماحول ہے مختلف محاذوں پر کام کرنے والے خادمان دین و ملت ایک دوسرے کے رفیق و معاون بننے کے بجائے ایک دوسرے کے فریق بلکہ حریف نظر آتے ہیں، اس سے دینی کاموں کا زبردست نقصان ہو رہا ہے، اور ہماری توانائیوں کا خاصا حصّہ باہمی کشمکش میں ضائع ہو رہا ہے، اس سے آگے کی

بات یہ ہے کہ ایک ہی میدان کار سے وابستہ خادمان دین کے درمیان ناپسندیدہ تنافس اور کشاکش کا ماحول ہے، ایک مدرسہ والا دوسرا مدرسہ قائم ہونے سے رنجیدہ ہو جاتا ہے، اور دوسرا مدرسہ قائم کرنے والوں کو اپنا حریف سمجھنے لگتا ہے، یہی حال اسکولوں، کالجوں، اور دوسرے دینی و ملی کاموں اور اداروں کا ہے،

حضرت قاری صاحبؒ اس صورتحال سے بہت رنجیدہ رہتے، اور فرماتے کہ اگر ہم لوگ یہ سارے کام اللہ کی رضامندی کیلئے کر رہے ہیں، تو مزید کچھ لوگوں کے اس کام سے جڑنے سے ہمیں خوشی ہونی چاہئے، ہمیں ان کا شکر گذار ہونا چاہئے شکوہ، شکایت کا کیا معنیٰ! جس طرح اگر ہم کسی جنازہ کو کاندھا دیکر قبرستان لے جا رہے ہوں، اسی دوران کچھ اور لوگ آکر ہمارے ساتھ شریک ہو گئے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے، اور ہم انکے شکر گذار ہوتے ہیں۔ حضرت قاری صاحبؒ نے اپنی بساط بھر تمام دینی و ملی کاموں میں حصہ لیا، ہر دینی کام کی سرپرستی فرمائی، اپنا پورا تعاون دیا، اپنی ذات اور اپنے اثرات سے جس کام کو جتنا فائدہ پہنچا سکتے تھے، اس میں بالکل دریغ نہیں کیا۔

حضرت قاری صاحبؒ خود مدارس کی پیداوار تھے، ہندوستان کے ہر خطہ اور ہر آبادی میں مدارس و مکاتب کے قیام کو اہم ترین دینی و ملی ضرورت قرار دیتے ہتھورا کا مدرسہ جو ایک مکتب سے ترقی کرکے ہندوستان کے چند بڑے مرکزی مدارس میں شمار ہونے لگا، حضرت قاری صاحبؒ کے اخلاص اور جہد پیہم کا ثمرہ ہے، بندیل کھنڈ (ضلع باندہ اور اس کے اطراف کے اضلاع) کے قصبات اور دیہاتوں میں بلا مبالغہ ہزاروں چھوٹے مدارس و مکاتب حضرت قاری صاحب کی توجہ سے قائم ہوئے، بہت سے مکاتب کے مدرسین

کی تنخواہوں کا بندوبست خود حضرت قاری صاحبؒ کرتے ۔ خدا جانے ہندوستان کے اطراف و اکناف میں کتنے چھوٹے، بڑے مدارس موصوف کی تحریک اور توجہ دہانی پر قائم ہوئے، شہر بستی کا "دارالعلوم الاسلامیہ" جو تعلیم و تربیت کے میدان میں اپنا ممتاز مقام پیدا کر چکا ہے، اسکے اولین محرک حضرت قاری صاحبؒ تھے، ہر مرحلہ میں موصوف نے اس ادارہ کی رہنمائی کی، اور ہمیشہ اس کے مسائل و مشکلات کیلئے فکرمند رہے، ایک سال پہلے جب یہ ادارہ مخالف حالات کے نرغے میں آگیا، اور ادارہ کا وجود خطرہ میں نظر آنے لگا تو حضرت قاری صاحبؒ نے اپنی شدید بیماری کے باوجود ادارہ کے تحفظ کیلئے اپنے تمام اثرات استعمال کئے، اور برابر فکرمند رہے۔

مدارس و مکاتب کے قیام و فروغ پر پوری توجہ کیساتھ حضرت قاری صاحبؒ تبلیغی کام سے بھی برابر جڑے رہے، موصوف حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی تبلیغی تحریک کو امت مسلمہ بلکہ عالم انسانیت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے تھے، نظریاتی طور پر ہی اس سے متفق نہیں تھے، بلکہ تبلیغی کام میں عملی شرکت کرتے تھے، اس کام کی تائید اور سرپرستی فرماتے تھے، تبلیغی مرکز کے اکابر سے ان کا گہرا ربط تھا، مولانا مرحوم کی خواہش اور کوشش تھی کہ مدارس اور تبلیغی جماعت ایک دوسرے سے قریب آئیں، اور ایک دوسرے کیلئے معاون ہوں، کچھ دنوں سے اور کچھ علاقوں میں اہل تبلیغ اور اہل مدارس کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری کو حضرت قاری صاحبؒ فکر و تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے، اور انھیں قریب لانے، نیز اعتدال پیدا کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔

حضرت قاری صاحبؒ تمام دینی و ملی تحریکات اور کاموں میں خواہ عملی

شرکت نہ کر پاتے ہوں، لیکن تمام کاموں کے موید اور بہی خواہ تھے، دینی تعلیمی کونسل اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی اہمیت و افادیت کے بہت قائل تھے، امارت شرعیہ اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے کاموں سے بھی انھیں دلچسپی تھی عصری تعلیم کے اداروں کو بھی ملت کی اہم ضرورت قرار دیتے تھے لیکن ضروری سمجھتے تھے کہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں بنیادی دینی تعلیم کو بھی شامل کیا جائے،

موصوف تجارت اور صنعت و حرفت کے میدان میں بھی مسلمانوں کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے، اور مسلمانوں کی معاشی بدحالی سے رنجیدہ رہتے تھے، تاجروں اور صنعت کاروں کا بڑا حلقہ حضرت قاری صاحبؒ کا عقیدتمند اور نیازکیش تھا، حضرت قاری صاحبؒ کے ذریعہ اس حلقہ میں بھی بڑا اصلاحی اور دعوتی کام ہوا، انکی خواہش اور اصرار پر موصوف بسا اوقات دوکانوں اور فیکٹریوں کا افتتاح فرماتے اور برکت کی دعا کرتے ۔ ایک بار حضرت قاری صاحبؒ نے جناب مولانا عبد القیوم صاحب (ناظم مدرسہ اصلاح المسلمین جمداشاہی، بستی) سے فرمایا: بعض لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے کہ میں فیکٹری یا دوکان وغیرہ کے افتتاحی پروگرام میں شریک ہوجاتا ہوں، میرے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ اس بہانے بہت سے ایسے لوگوں کے سامنے دین کی باتیں سنانے کا موقع مل جاتا ہے، جو عام طور دینی اجتماعات وغیرہ میں شرکت نہیں کرتے، نیز ایسے موقع پر میں غریب و نادار مسلمانوں کو ملازمت دینے کی بات بھی رکھتا ہوں، اس طرح بہت سے نادار، اور بے روزگار مسلمان بھائی کام سے لگ جاتے ہیں ۔

تحریر و تصنیف کے ذریعہ دین کی خدمت کو بھی حضرت قاری صاحبؒ

پوری اہمیت دیتے تھے، حضرت قاری صاحبؒ نے بے پناہ تدریسی، اصلاحی، دعوتی مصروفیات کے باوجود تحریر و تصنیف کیلئے بھی وقت نکالا، متعدد درسی کتابوں کی شرح لکھی، بعض نصابی کتابیں تیار کیں، بعض انتہائی مفید اصلاحی رسالے تیار کئے، حضرت قاری صاحبؒ کی ہمت افزائی، اور توجہات کے نتیجہ میں ان کے مدرسہ کے بعض اساتذہ (جناب مولانا مفتی عبید اللہ الاسعدی صاحب، جناب مفتی محمد زید صاحب) نے گرانقدر تصنیفی اور تالیفی خدمات انجام دیں، موصوف میرے تصنیفی ذوق سے اچھی طرح واقف تھے، اکثر ملاقات ہونے پر یہ ضرور دریافت فرماتے کہ آجکل کیا لکھ رہے ہیں، اور بعض اوقات ہمت افزائی کے کلمات ارشاد فرماتے، ایک بار جب مظاہر علوم سہارنپور کا نزاع اپنے شباب پر تھا دار العلوم ندوۃ العلماء میں حضرت قاری صاحبؒ سے ملاقات ہوئی، مظاہر علوم کے نزاع پر بہت دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بڑے درد سے فرمایا، آپ کوئی ایسا مضمون لکھئے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دونوں گروہوں کے درمیان صلح کرا دے، میں دم بخود رہ گیا، اور عرض کیا کہ حضرت یہ تو آپکا مقام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کی شخصیت میں بڑی وسعت اور جامعیت تھی، دین و ملت کا کام جس میدان اور جس محاذ پر ہو رہا ہو، اور جس بینر کے تحت ہو رہا ہو، حضرت قاری صاحبؒ اس کی تائید فرماتے، اور اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون پیش فرماتے، اللہ تعالیٰ نے انکے دل و دماغ کو جھنڈا اور قیادت کی آلائشوں سے پاک کر رکھا تھا، وہ دین و ملت کے خادم بن کر رہے اور خادم بن کر مرے، اللہ تعالیٰ انکی تربت کو نور و رحمت سے بھر دے، آمین۔

(نہم) انسانیت و شرافت | حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ

پر مضمون لکھنے کا خیال ہوا، تو مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ کی تصنیف "حکیم الامۃ" کے دیباچہ کا ابتدائی حصہ ذہن میں گردش کرنے لگا، مولانا دریاآبادی نے لکھا تھا:۔

"حکیم الامت امام اشرف علی تھانوی بزرگ کس مرتبہ اور ولی اللہ کس پایہ کے تھے اس کا حال تو وہ ہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو، اپنے کو تو اس کو یہ کی ہوا بھی نہیں لگی، اس لئے اگر کسی صاحب نے کتاب کو اس ارادہ سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مناقب عرفانی و مدارج روحانی کا بیان ہوگا تو خیر اسی میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائیں، اور کتاب بے پڑھے بند کے بند رہنے دیں ...... "حضرت شیخ" کے کمالات و فضائل جو کچھ بھی ہوں، بہرحال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اس صدی میں ہوئے ہیں، انکی عمر کے آخری پندرہ سولہ سال کے زمانہ میں اس نامہ سیاہ کو ان سے نیاز اور گہرا نیاز حاصل رہا، اور اس نے اپنے لیے تجربہ اور سابقہ میں انھیں ایک بہترین انسان پایا، بس انکی اسی انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس ان "نقوش و تاثرات" کے اندر بند کر دینے کی کوشش الٹی سیدھی کو یہاں ملے گی۔"

(حکیم الامت نقوش و تاثرات ص۱-۲)

حضرت مولانا قاری صدیق احمدؒ باندوی کو دور و نزدیک سے جس قدر سنا اور دیکھا انکے بارے میں میرا تاثر یہی ہے کہ موصوف کا سب سے نمایاں وصف انکی انسانیت ہے، حضرت قاری صاحبؒ بلند انسانی صفات کے حامل تھے، ان کے یہاں پورے عالم انسانیت کیلئے فکرمندی اور دلسوزی تھی، ان جیسا انسان دوست، انسانیت نواز شخص مدتوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ ہر ایک کے غم اور مصیبت کی کسک اپنے دل میں محسوس کرتے تھے، اور ہر ایک کے کام

آنے کی کوشش کرتے تھے، ان کے دروازے ہر مذہب و مسلک کے پریشان حالوں، ضرورت مندوں، اور ستم رسیدوں کے لئے کھلے ہوئے تھے، وہ دکھے دلوں پر مرہم رکھتے، پریشان حالوں کی تسکین و اطمینان کا سامان کرتے، اپنے تعلقات اور اثرات کو کام میں لاکر حاجتمندوں کی حاجت پوری کرتے، کسی کے کام آنے پر جیسے خود ممنون ہو رہے ہوں، اس بارے میں حضرت قاری صاحب مرحوم کا حال وہی ہے، جس کا اظہار اردو کے مشہور شاعر امیر مینائیؒ نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر ؎ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

تمام مادی اور سائنسی ترقیات کے باوجود انسانوں کی اس دنیا میں سب سے زیادہ کمی انسانیت کی ہے، مادہ پرستانہ نقطۂ نظر نے پوری انسانی آبادی کو خود غرض، مفاد پرست اور استحصال پسند بنا دیا ہے، ہر شخص اپنی ادھیڑ بن اور معاشی حوصلہ مندیوں میں اس قدر مصروف اور منہمک ہے کہ اسے دوسرے کی داستانِ غم سننے کا موقع نہیں، ہمدردی کرنا، اور شریک غم ہونا تو دور کی بات ہے، مصیبت کے وقت میں قریب ترین اعزا اور احباب آنکھیں پھیر لیتے ہیں، اور اجنبی بن جاتے ہیں، اس اعتبار سے حضرت قاری صاحبؒ اس دور کے انسان نہیں تھے، دوسروں کے کام آنے اور انھیں راحت پہونچانے کیلئے انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کر رکھا تھا، انکی اس مسلسل روش نے بہت سے غالی عقیدتمندوں میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ حضرت قاری صاحبؒ کو راحت و آرام کی ضرورت نہیں ہے، خلق خدا کی نفع رسانی کے سلسلے میں موصوف کا عمل اس ارشاد نبوی پر تھا "اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ (زمین والوں پر رحم کرو، تم پر آسمان والا رحم کرے گا)

(۵) غیر معمولی مجاہدہ و ریاضت

حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی سے غیر معمولی مجاہدہ و ریاضت کی تھی، ان کا بچپن اور نوجوانی اگر فقر اضطراری میں گذرے تو جوانی اور بڑھاپا فقر اختیاری میں گذرے بچپن اور طالب علمی کے دور میں بار بار فقر و فاقہ کی نوبت آئی اور انتہائی تنگی و ترشی کے حالات پیش آئے لیکن انکے ذوق طلب میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ انھوں نے پورے صبر و ہمت سے اپنا علمی سفر جاری رکھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ان کے لئے معاشی فارغ البالی کے مواقع تھے لیکن انھوں نے ہر میدان میں رخصت کے بجائے عزیمت کا راستہ اختیار کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے مختصر مدت کیلئے بعض مدارس میں تدریس کی ملازمت کی لیکن جب انکو یہ اطلاعات ملیں کہ ان کے علاقے میں شدھی سنگٹھن تحریک کے اثر سے بعض جاہل مسلمان خانوادے ارتداد کی گود میں چلے جا رہے ہیں، تو انکی غیرت ایمانی کو جوش آیا، اور انھوں نے ارتداد کے اس سیلاب کو روکنے کا عزم مصمم فرمایا، اور باندہ نیز اس کے قریبی اضلاع کو اپنی دعوتی اصلاحی اور تعلیمی جد جہد کا مرکز بنایا جن مقامات پر ارتداد کے واقعات پیش آئے تھے، وہاں بہ نفس نفیس تشریف لیجا کر ان سے مرتدین کو سمجھایا، انکی کوششوں سے بہت سے مرتدین اسلام میں واپس آئے، اور ارتداد کا سیلاب رک گیا۔ اس کام میں حضرت قاری صاحبؒ نے غیر معمولی مجاہدہ کیا، اپنے کو خطرات میں ڈال کر یہ عظیم کام انجام دیا، یہ کام اتنا نازک تھا کہ تھوڑی سی بے صبری اور بے تدبیری سے ہندو مسلم قضیہ بن جاتا، اس لئے حضرت قاری صاحبؒ نے بڑی حکمت، اور فہم و فراست کے ساتھ خاموشی سے انجام دیا۔

حضرت قاری صاحبؒ نے اپنی بصیرت سے محسوس کیا کہ اس صورتحال کا اصل علاج دینی تعلیم و تربیت کا فروغ ہے، کیونکہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد توحید رسالت، بنیادی اسلامی عقائد اور احکام سے ناآشنا ہے، اسے دین کی حقیقت واہمیت ہی معلوم نہیں ہے، بہت سے مشرکانہ اعمال و رسوم مسلمانوں میں رائج ہیں، اس لئے سب سے بنیادی اور اہم کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو تعلیمی اور اصلاحی کوششوں کے ذریعہ اسلام کے بنیادی عقائد و احکام سے واقف کرایا جائے ان میں دینی شعور بیدار کیا جائے۔

حضرت قاری صاحبؒ نے انتہائی افلاس اور بے سروسامانی کی حالت میں اپنے گاؤں ہتھورا (ضلع باندہ) میں ایک دینی مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، اس مدرسہ کے قیام و استحکام میں حضرت قاری صاحب، انکی اہلیہ محترمہ اور اہلِ خانہ نے غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ ایک زمانہ تک طلبہ کا کھانا حضرت قاری صاحب کے گھر سے پک کر آتا تھا۔ اور تمام طلبہ کی خبر گیری، انکی ضروریات کی فراہمی حضرت قاری صاحبؒ اور ان کے اہل خانہ ہی سے وابستہ تھی، نظم و انتظام کے علاوہ کئی مدرسوں کے بہ قدر تدریس کا بوجھ حضرت قاری صاحبؒ نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا، اور انھیں اسباق کا ناغہ کسی حال میں گوارا نہ تھا، اسفار کی وجہ سے اگر دن میں سبق پڑھانے کا موقع نہ ملتا، تو جب بھی سفر سے واپسی ہوتی دیر رات میں یا فجر سے پہلے اسباق پڑھا دیا کرتے، دعوتی، اصلاحی اسفار کا سلسلہ بھی برابر رہتا تھا، دور نزدیک کے گاؤں اور قصبات میں بسا اوقات پیدل تشریف لے جاتے، اور دین کی باتیں سنا کر واپس آجاتے، ابتدائی چند سال بسا اوقات بن بلائے، دعوتی و اصلاحی جذبے کے تحت مختلف آبادیوں میں جا کر موعظتِ حسنہ اور حکمت کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام

انجام دیتے۔ ان اسفار میں کثرت سے مخالفت اور ناگوار حالات سے دوچار ہوتے لیکن راہ خدا میں ان کلفتوں کو بھی خوشی گوارا فرماتے بعض علاقوں میں اہل بدعت کی طرف سے ایذا رسانیاں پیش آئیں، اور مناظرے کے چیلنج کئے گئے، حضرت قاری صاحبؒ نے حلم وصبر سے ان حالات کو برداشت کیا، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ مناظرہ اور مقابلہ آرائی کا راستہ اپنانے سے دعوت واصلاح کے امکانات محدود، بلکہ مسدود ہو جائیں گے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی محنت و مجاہدہ سے عبارت تھی، ہمہ وقت مصروف سعی وعمل رہا کرتے تھے، کرتے کرتے مرنا اور مرتے مرتے کرنا ان کی زندگی کا اصول تھا، ہر کام سے جلدی سے فارغ ہونا چاہتے تھے تاکہ دوسرا دوسرا کام شروع کر سکیں، فرصت وفراغت کے لمحات بس وہی تھے جو اضطراراً پیش آجاتے ہوں، طویل پرمشقت سفر کر کے کسی جلسہ میں بسا اوقات عین موقع پر پہونچتے، تقریر کرنے کے بعد فوراً دوسرا پرمشقت سفر شروع ہو جاتا، سواری کوئی بھی ہو، ریل گاڑی سے لیکر بیل گاڑی تک ہر سواری انکے لئے مسخر تھی ہر جگہ دعا، تعویذ والوں اور اصحاب حاجات کا ہجوم ہوتا، حضرت قاری صاحب کی تشریف آوری کی بھنک لگتے ہی خلقت ٹوٹ پڑتی، اور حضرت قاری صاحب ان کے درمیان گھر جاتے، یہ بھیڑ اس کا موقع بھی نہیں دیتی کہ قاری صاحبؒ اطمینان کے ساتھ اپنی ضروریات سے فارغ ہولیں، یا کچھ آرام کر لیں، یہی صورتحال تقریباً ہر جگہ پیش آتی، میرا اپنا اندازہ ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی میں نیند اور آرام کا اوسط دو تین گھنٹہ یومیہ سے زیادہ نہیں رہا ہوگا، کثرت سے پیدل چلنے، اور مسلسل مجاہدہ وریاضت کی وجہ سے ان کا جسم پہلوانوں کی طرح کسا ہوا تھا، مدرسہ کے تعمیری کاموں میں بسا اوقات

مزدوروں کی طرح کام کرتے، انکو دیکھ کر مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ بھی ان کاموں میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے،

سفر ہو یا حضر قاری صاحبؒ کے معمولات ناغہ نہ ہوتے، نماز تہجد، اور آہِ سحرگاہی ان کی زندگی کا ناگزیر حصہ تھے، رات میں خواہ کتنی تاخیر سے سوئے ہوں، آخرِ شب میں اپنے مولیٰ کے حضور سر بسجود ہوتے، اور نالۂ نیم شبی کے ذریعہ اپنے مولیٰ سے رشتۂ عبدیت مضبوط اور استوار کرتے۔

حضرت قاری صاحبؒ نے جس مجاہدہ و ریاضت کے ساتھ پوری زندگی گذاری اس طرح کی زندگی ہم جیسے کوتاہ ہمتوں کیلئے چوبیس گھنٹہ گذارنا مشکل ہے، حضرت قاری صاحب یہ کہنے میں بالکل حق بہ جانب ہوتے ہے

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جسطرح
میں نے تمام عمر گذاری ہے اس طرح

(۴) تدریسی ذوق و مزاج

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحبؒ کامیاب ترین مدرس و مربی تھے، انھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی کیساتھ درسِ نظامی کی تعلیم ماہر ترین اساتذہ سے حاصل کی تھی، حافظہ قوی، استعداد پختہ، اندازِ تفہیم دلنشیں اور شخصیت دلآویز تھی، غرضیکہ حضرت قاری صاحب میں کامیاب مدرس کی تمام صفات موجود تھیں، انھوں نے تمام مصروفیات اور معذوریوں کے باوجود درس و تدریس کا شغل پورے اہتمام اور دلچسپی کے ساتھ جاری رکھا، اور دوسرے کاموں کی طرح یہ کام بھی عبادت سمجھ کر انجام دیا، حضرت قاری صاحبؒ کامیاب ترین مدرس ہی نہیں بلکہ بہترین ماہر تعلیم بھی تھے، انکی کتابیں (آداب المعلمین، آداب المتعلمین) ان کے تعلیمی نظریات کی عکاسی کرتی ہیں،

ہمتوں کی پستی اور ذکاوت میں انحطاط کے پیش نظر نصاب تعلیم کو آسان بنانے کا حضرت قاری صاحبؒ کا مستقل منصوبہ تھا جس کا کچھ حصہ ان کے ذریعہ اور ان کے بعض شاگردوں کے ذریعہ بروئے عمل آیا۔

حضرت قاری صاحبؒ نے مرتے دم تک تدریس کا شغل جاری رکھا اور ان کے حلقۂ درس سے بے شمار علماء تیار ہوئے، ان کا اصل ذوق تدریس ہی کا تھا، وعظ و تقریر ان کے مزاج کی چیز نہیں تھی، لیکن انھوں نے اصلاح و دعوت کے جذبہ کے تحت اس وادی میں بھی قدم رکھا، اور اپنے اخلاص اور سوز دروں کی وجہ سے اس میں بھی کامیاب رہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کا آخری چند سال جو حال تھا اس کے ساتھ ان کا تدریسی ذمہ داریوں کو انجام دینا ایسی استقامت تھی جو ہزار کرامتوں سے بڑھ کر ہے، انکی محبوبیت اور مرجعیت نقطۂ عروج پر تھی، ان کا آفتاب ہدایت نصف النہار پر تھا، جہاں ہوتے متعلقین اور طالبین کا ہجوم ہوتا، دعوتی، اصلاحی اسفار کی کثرت تھی، امراض و اعذار ان پر مستزاد تھے، ان سب کے باوجود تدریس کو محض نبھانا نہیں بلکہ بخوبی انجام دینا حضرت قاری صاحبؒ کا ہی کام تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصل ذوق و مزاج تدریس کا تھا، وہ تدریس کو علماء کا اولین کام سمجھتے تھے، ایک بار میرے بارے میں حضرت قاری صاحبؒ کو اطلاع ملی کہ میں نے تدریس کا شغل ترک کر کے اپنے کو تصنیف و تالیف کیلئے یکسو کر لیا ہے تو انھوں نے حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب (بانی دارالعلوم الاسلامیہ بستی) کے ذریعہ کہلایا کہ اصل کام تو تدریس کا ہے، اسے ترک نہیں کرنا چاہیے۔

(۷) فہم و فراست، حافظہ و ذکاوت | حضرت مولانا قاری صدیق احمد

صاحبؒ دیکھنے میں بظاہر سیدھے، سادے، سادہ لوح، صوفی قسم کے انسان نظر آتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں بلا کی فہم و فراست سے نوازا تھا، ایک نظر میں معاملات کی تہہ تک پہونچ جاتے تھے، انھیں صحیح معنی میں مومن کی فراست نصیب ہوئی تھی، تمام انسانی طبقات کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے، اور ہر طبقہ سے اسی کی نفسیات کے مطابق معاملہ کرتے تھے، انکی فہم و فراست کا اندازہ اس وقت خاص طور سے ہوا، جب بعض نزاعی معاملات میں انکی ذات اور نام کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی، قاری صاحبؒ نے بڑی خوبصورتی اور حکمت سے ان خلافیات سے اپنا دامن بچالیا، اور کسی فریق کی دل آزاری نہیں ہونے دی ان کا مزاج نزاعی معاملات سے بچنے کا تھا، اللہ تعالیٰ نے انھیں اس میں بھی کامیابی بخشی، اس دور فتن میں فتنوں اور اختلافات سے دامن بچالینا، اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی شہرت بڑھنے پر اصحاب ثروت طبقہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوا، اور بعض دوسرے بزرگوں کی طرح ان کے گرد بھی گھیرا ڈالنا چاہا، لیکن حضرت قاری صاحبؒ نے یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی، اور اپنی فہم و فراست نیز عزیمت کی بناء پر اس مرحلے سے بھی کامیاب گذرے ــــ اصحاب ثروت سے دینی ضرورت کے تحت بہ قدر ضرورت رابطہ تو رکھا، انھیں اصلاح و تربیت کا فائدہ پہنچایا، لیکن ان سے ایسا خلا ملا نہیں کیا کہ ان سے تعلقات زنجیر پا بن جائیں، اور عام غریب مسلمانوں سے رابطہ کمزور پڑ جائے، حضرت قاری صاحبؒ نے فقر کے باوجود استغنا، اور خودداری پر آنچ نہ آنے دی، ہدیہ تحائف قبول کرنے، اور اصحاب ثروت سے ادنیٰ نفع اٹھانے میں انتہائی محتاط رہے، زندگی بھر ان کا یہ حال رہا، تمام عمر اسی احتیاط میں گذری کہ

آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو۔

حضرت قاری صاحبؒ کا حافظہ بھی بہت غضب کا تھا، درسیات پر انھیں مکمل عبور تھا روزانہ سیکڑوں، ہزاروں انسانوں سے انکی ملاقات ہوتی، لیکن جن کے حالات مشکلات و مسائل کو ایک بار سن لیا، ان کے ذہن پر نقش ہوگیا، بسا اوقات انسان سوچتا تھا کہ قاری صاحبؒ سے میری ملاقات صرف ایک دو بار کی ہے وہ بھی سرسری، قاری صاحبؒ مجھے کیا پہچانیں گے، لیکن گفتگو سے اندازہ ہوتا کہ وہ نہ صرف پہچانتے ہیں، بلکہ ذوق و رجحان، حالات و مسائل سے بھی واقف ہیں۔ حضرت قاری صاحب ذہانت اور ذکاوت میں بھی ممتاز تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے جو غیر معمولی کام لیا، اس میں انکی ذکاوت کا بھی غیر معمولی دخل تھا۔

(۸) مدرسہ اور اپنے اثرات سے ذاتی انتفاع سے گریز

ہتھورا باندہ کا مدرسہ عربیہ جس کا قیام و استحکام تمام حضرت قاری صاحبؒ کی قربانیوں اور توجہات کا رہین منت ہے، یہ مدرسہ ایک مکتب سے عظیم الشان دارالعلوم کے مرحلہ تک حضرت قاری صاحب کے خون جگر سے پہونچا، حضرت قاری صاحب نے اس ادارہ پر اپنا سب کچھ قربان کیا، لیکن اس سے کوئی ادنیٰ مادی فائدہ حاصل نہیں کیا، زندگی بھر ایک پیسہ تنخواہ لئے بغیر اس ادارہ کی ہر طرح کی خدمت کی، زندگی بھر ان کا عمل یہی رہا کہ طاعات پر اجرت نہیں لی، لکھنے اور کہنے کو تو یہ بات آسان ہے، لیکن ایک مفلوک الحال، کثیر العیال شخص کے لئے زندگی بھر اس روش پر قائم رہ جانا ہر کرامت سے بڑی کرامت ہے، حضرت قاری صاحب کوئی صاحب ثروت شخص نہیں تھے، معمولی کھیتی باڑی

پہ گذران تھا، معاشی ضرورتوں کے تحت کبھی ہلکی پھلکی تجارت کرلیا کرتے تھے ایسے حالات میں مدرسہ سے کوئی تنخواہ نہ لینے کا فیصلہ کرنا اور زندگی بھر اس پر قائم رہنا بڑے دل گردے کی بات تھی، بعض حضرات ظاہر یہ کرتے ہیں کہ مدرسہ سے تنخواہ نہیں لیتے ہیں، لیکن کفاف کے نام پر مدرسہ پر اتنا بڑا بوجھ ڈالتے ہیں جو کئی تنخواہوں پر بھاری ہوتا ہے، حضرت قاری صاحب کا دامن ایسی "تدبیروں" سے ہمیشہ پاک رہا، ان کے گھر میں کھانے پینے کا معیار بہت سادہ اور معمولی ہوتا تھا، فاقوں کی بھی نوبت آجاتی تھی، مدرسہ کے طلبہ کیلئے جو کھانا پکتا تھا، عام طور پر اس معیار کا کھانا بھی گھر میں نہیں ہوتا تھا، اور مجال نہ تھی کہ مدرسہ سے غلہ، اجناس یا پکا ہوا کھانا گھر پہونچ جائے۔

حضرت قاری صاحبؒ کے تینوں صاحبزادگان تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ میں تدریس سے وابستہ ہوئے لیکن کسی کی تنخواہ مقرر نہیں کی سب للّٰہ فی اللّٰہ یہ خدمت انجام دیتے رہے، اپنے بچوں کو مدرسہ کے معاملات میں دخیل نہیں بنایا، انتظامی خصوصاً مالی معاملات سے دور رکھا، بہت سے مدارس میں صاحبزادگان کی لائن سے جو تباہیاں آئی ہیں، حضرت قاری صاحبؒ ان سے بخوبی آگاہ تھے، نااہل ہونے کے باوجود بانی مدرسہ یا مہتمم مدرسہ کے صاحبزادے والد کی زندگی ہی میں سیاہ وسفید کے مالک بن جاتے ہیں بسا اوقات اپنے والد کو بھی حالات سے بے خبر اور مجبور محض بنا دیتے اس کی وجہ سے جمے جمائے مدارس اجڑنے لگتے ہیں اور تعلیمی ماحول ختم ہونے لگتا ہے، حضرت قاری صاحب یہ الزام لینے کو تیار نہ تھے کہ انھوں نے یا انکی اولاد نے مدرسہ سے کسی طرح کا نفع اٹھایا، وہ اپنے صاحبزادگان کو بھی زہد وقناعت اور توکل کی اسی زندگی پر ڈالنا چاہتے تھے جس پر وہ

تا عمر کاربند رہے۔

مدرسہ قائم ہونے کے بعد بھی اپنی خانگی زندگی میں حضرت قاری صاحبؒ جس عسرت اور تنگی سے دوچار تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے جسے انھوں نے اپنے پیر بھائی جناب مولانا محمد عبدالقیوم صاحب (ناظم مدرسہ اصلاح المسلمین جمدا شاہی بستی) سے بیان فرمایا، حضرت قاری صاحبؒ نے مولانا موصوف سے بیان فرمایا: کہ لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ مجھ پر کیا کیا حالات گذرے، ایک زمانہ میں گذران کی اتنی تنگی تھی کہ میں شہر باندہ سے آلو خریدتا اسے آٹھ نو گٹھریں باندھ لیتا تاکہ اٹھانا آسان ہو، بس سے لاد کر نومیل (ایک مقام کا نام ہے) پر لاتا، وہاں سے متھورا ڈیڑھ کلو میٹر فاصلہ پر ہے، نومیل سے متھورا آلو کے گٹھر اس طرح لاتا کہ ایک گٹھر کچھ فاصلہ پر اٹھا کر رکھتا، دوسرا گٹھر اس سے کچھ آگے لیجا کر رکھتا اسطرح سارے گٹھر یکے بعد دیگرے منتقل کرتا رہتا، رفتہ رفتہ متھورا پہنچ جاتا، یہ آلو متھورا میں بیچ لیتا، اصل قیمت نکل جانے کے بعد جو آلو بچتے اسی سے گھر کا خرچ چلتا، کبھی کبھی آلو ہی پر گذارا کرنا پڑتا۔

مدرسہ کے علاوہ خود اپنی مقبولیت اور اثرات سے بھی حضرت قاری صاحبؒ نے کوئی مادی نفع نہیں اٹھایا، اور تاحیات فقر و فاقہ کی روش پر قائم رہے، حالانکہ حضرت قاری صاحبؒ کو جو مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی وہ شاذ و نادر ہی کسی کو حاصل ہوتی ہے، بڑے بڑے سرمایہ دار آپ کی خدمت کو سرمایۂ سعادت تصور کرتے تھے، لیکن قاری صاحبؒ نے ان سے ادنیٰ ذاتی منفعت حاصل نہیں کی، بسا اوقات بزرگوں کے اثرات اور انکی مقبولیت کو انکے اہل خاندان یا خاص حلقہ کے لوگ کیش کرا لیتے ہیں، حضرت قاری صاحبؒ ان سب باتوں سے محفوظ رہے، اور ان کی شانِ فقر و زہد پر کوئی دھبہ نہیں آیا۔

(۹) محبوبیت و مرجعیت

حضرت قاری صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے شان محبوبیت عطا فرمائی تھی، وہ اپنے اساتذہ اور مشائخ کے محبوب تھے، ساتھیوں اور دوستوں کے محبوب تھے، تلامذہ و معتقدین کے محبوب تھے، اللہ تعالیٰ نے انکی شخصیت میں بلا کی کشش اور جاذبیت رکھی تھی، ان سے جو ایک بار بھی ملا ان کا گرویدہ ہوگیا اور ان سے محبت کرنے لگا

انکی نیاز مندی، شرافت، انقیاد و اطاعت، ذکاوت و ذہانت محنت و مجاہدہ کی وجہ سے اساتذہ ان پر بے پایاں شفقت و محبت کرتے تھے، اساتذہ اور احباب سب محسوس کرتے تھے کہ اس طالب علم کی شان ہی نرالی ہے، یہ مستقبل میں کسی بڑے مقام پر فائز ہونے والا ہے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی　٭　می تافت ستارۂ بلندی

مظاہر علوم سہارنپور کے زمانۂ طالب علمی میں حضرت قاری صاحبؒ کا حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مظاہر علوم و خلیفہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے خصوصی ربط و تعلق تھا، حضرت ناظم صاحبؒ ان پر غیر معمولی شفقت اور اعتماد فرماتے تھے، ایک بار حضرت قاری صاحبؒ حضرت ناظم صاحب سے اجازت لئے بغیر بعض خاص اسباب کی بنا پر سہارنپور سے کہیں چلے گئے، اس پر حضرت ناظم صاحب نے متعدد نظمیں کہہ ڈالیں، جن سے ان کی شفقت و محبت اور غایت تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے، حضرت ناظم صاحب (مولانا اسعد اللہ صاحبؒ) حضرت قاری صاحب کا تذکرہ اپنی مجلسوں میں بکثرت کیا کرتے، اور ان کے بارے میں بڑے بلند کلمات فرماتے تھے، حضرت ناظم صاحبؒ کے ایک خلیفہ

جناب مولانا عبدالقیوم صاحب (جمداشاہی ضلع بستی) بیان کرتے ہیں کہ حضرت ناظم صاحبؒ اس کثرت اور عظمت سے حضرت قاری صاحبؒ کا تذکرہ فرماتے کہ ہم لوگوں کے دل میں ان کی زیارت و ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا، ہم لوگوں نے حضرت ناظم صاحبؒ سے دریافت کیا کہ ان کا پتہ لکھوا دیجئے تاکہ ہم لوگ انکی خدمت میں حاضر ہو سکیں، حضرت ناظم صاحبؒ نے القاب و آداب کیساتھ ان کا نام لکھنا شروع کیا: مولوی، مولانا، حافظ، قاری، صوفی...... کثیر القاب و آداب سن کر ہم لوگوں کو ہنسی آ گئی، تو حضرت ناظم صاحب نے فرمایا، بلاشبہ وہ ان تمام القاب و آداب کے مستحق ہیں، بلکہ ان سے کہیں زیادہ القاب کے مستحق ہیں بے لاریب وہ صاحب کرامات ہیں، میں نے عرض کیا، آپ انھیں "صاحب کرامات" بتا رہے ہیں، کوئی ایک کرامت تو سنا دیجئے! حضرت ناظم صاحبؒ نے فرمایا: ان کی کرامات تو بہت ہیں، صرف ایک کرامت جو خود میرے ساتھ پیش آئی ہے سن لیجئے! چند سال پہلے سیتاپور میں میری آنکھ کا آپریشن ہوا، وہاں تیمارداروں میں حافظ صاحب (قاری صدیق صاحبؒ) بھی تھے، آپریشن کے بعد تاکید ہوتی تھی کہ کافی وقت تک جسم میں کوئی حرکت نہ ہو، ورنہ آپریشن ناکام ہونے کا خطرہ ہے، میرے ساتھ واقعہ یہ پیش آیا کہ آپریشن کے چند گھنٹے بعد پورے جسم میں دانے نکل آئے، ان میں شدید جلن اور خارش ہونے لگی، شاید یہ کسی دوا کا ری ایکشن تھا، تیمارداروں کو فکر ہوئی کہ مبادا جسم میں حرکت ہو اور آپریشن ناکام ہو جائے، ایک صاحب ڈاکٹر کو بلانے کیلئے روانہ ہو گئے، راستہ میں حافظ صاحب سے انکی ملاقات ہوئی، حافظ صاحب نے پورا حال پوچھا، اس کے بعد ان صاحب کو ڈاکٹر کے پاس جانے سے منع کر دیا، اور سیدھے میرے پاس آئے، کچھ پڑھ کر میرے جسم پر دم کرنے لگے، جہاں جہاں دم کرتے گئے سوزش

اور خارش ختم ہوتی گئی، تھوڑی دیر میں سارے جسم کے دانے ختم ہوگئے۔

معاصرین ایک دوسرے کے بہت کم قائل ہوتے ہیں، لیکن میں نے حضرت قاری صاحبؒ کے جتنے معاصرین اور ساتھیوں کو دیکھا سب حضرت قاری صاحب سے حد درجہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے، حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحبؒ (سابق ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ) اور حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ (ہمشیرزادہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم) حضرت قاری صاحبؒ کے ہم درس ساتھی اور جگری دوست تھے، ان تینوں کی دوستانہ ملاقات قابلِ دید ہوتی تھی، بے تکلفی کے ساتھ ہر ایک دوسرے کا حد درجہ احترام بھی کرتا تھا، مولانا مرتضیٰ صاحبؒ بے تکلفی میں حضرت قاری صاحبؒ کو "مولانا ہوا صاحب" کہتے تھے، یہ اس طرف اشارہ تھا کہ قاری صاحبؒ کو ایک جگہ قرار نہیں رہتے، ہر لمحہ ہوا کی طرح یہاں سے وہاں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی شہرت و مقبولیت خواص سے شروع ہو کر عوام تک پہونچی، اور برصغیر سے متجاوز ہو کر دوسرے ملکوں تک پہونچی، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بے شمار انسانوں کو فائدہ پہونچایا، اور جہاں گئے رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا، حضرت قاری صاحبؒ کے یہاں روایتی خانقاہی نظام نہیں تھا، بلکہ وہ خود چلتی پھرتی خانقاہ و مدرسہ تھے۔

◆◆◆◆◆

حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی رح

اور

دار العلوم الاسلامیہ

از: ——— مولانا ظہیر انوار قاسمی

عام انسانوں کی طرح بڑے اور بزرگ انسانوں میں مزاج وطبیعت کا فرق واختلاف اور تنوع بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے، موجودات عالم کی رنگارنگی اور چمن ہستی کی گوناگونی دیکھ کر انسان یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ع ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است
اسی طرح بزرگوں اور علماء ومشائخ کے مزاج وطبائع میں بھی فرق دیکھنے میں آتا ہے، اور ہر بزرگ پر کسی فکر اور جذبے کا غلبہ نظر آتا ہے، جو انکی خصوصیت اور وصفِ خاص بن جاتا ہے، اسی قانونِ قدرت کے مطابق ہمارے دور کے ولی اور عالم ربانی حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحبؒ پر دیگر فضائل وکمالات کے ساتھ درس وتدریس اور دینی مراکز ومدارس کے زیادہ سے زیادہ قیام اور انکے ذریعہ علوم دینیہ کی خدمت واشاعت اور دینی تعلیم وتربیت کے انتظام کا غلبہ تھا کہ ہندوستان جیسے ملک میں مدارسِ اسلامیہ ہی اشاعت وحفاظتِ دین کا سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ ہیں، یہی وہ نکتہ تھا جو بانیانِ دار العلوم دیوبند کے پیش نظر تھا، جس کے تحت انھوں نے ۱۸۵۷ء کی ناکامی

کے بعد ہندوستان بھر میں مکاتب و مدارس کا ایک مبارک سلسلہ قائم فرما دیا جن کی برکت سے عیسائیت اور انگریزی اقتدار کا پورا مقابلہ کیا جا سکا اور مثبت طور پر اسلام کی خدمت و اشاعت اور منفی طور پر مغربی تہذیب کا دفاع کیا گیا۔

حضرت مولانا باندویؒ نے یوپی کے مشرقی اضلاع خصوصاً اس کے دیہاتی علاقوں میں مسلمانوں کی پسماندگی و بدحالی، غربت و جہالت، اور دین سے ناواقفیت اور اس کے نتیجے میں دین سے بے تعلقی و بیگانگی، اور آگے چل کر فقر کے کفر میں بدل جانے، اور مسلمانوں کے (نعوذ باللہ) مرتد ہو جانے کے خطرات محسوس کئے تھے، جس کے تدارک کیلئے انھوں نے بجا طور پر ان دور افتادہ دیہاتی علاقوں میں مدارس و مساجد کے قیام کی اشد ضرورت محسوس کی اور اس مبارک مہم اور دینی سرگرمی کیلئے اپنے کو پورے طور پر وقف فرما دیا اور حتی الامکان خود بھی ایسے علاقوں میں اسلامی مدارس و مکاتب قائم کئے اور اپنے متعلقین کے ذریعے بھی اس کار خیر کا سلسلہ قائم کر دیا، وہ امت کو مدارس سے جوڑ دینا چاہتے تھے اور اس جوڑ اور تعلق کے ذریعہ امت کو تعلیم و ترقی کے راستے پر ڈالنا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس پر آشوب دور میں جبکہ ربانی علماء و مشائخ کی تعداد میں تشویشناک حد تک کمی واقع ہو گئی ہے، تو ایسے حالات میں مدارس ہی انکی تلافی کر سکتے ہیں، اور امت میں دین و اخلاق کی روشنی پھیلا سکتے ہیں،

اس عظیم دینی منصوبے کے تحت انھوں نے سب سے پہلے اپنے گاؤں ہتھورا (باندہ) میں جامعہ عربیہ کو بڑی محنت و مشقت اور دلسوزی و جانفشانی کے ساتھ قائم کیا، اور اسکو اپنی مسلسل محنت اور جذبۂ خدمت اور اخلاص نیت و عمل کی برکت سے ایک عظیم دینی مرکز کے درجے تک پہونچا دیا، اور اس کے ساتھ ہی

پورے ضلع، بلکہ ملحقہ اضلاع میں بھی دینی مکاتب و مدارس کا ایک جال پھیلا دیا، جن کے مبارک اثرات ان علاقوں میں آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں کہ جن علاقوں پر ارتداد کا خطرہ منڈلا رہا تھا، وہاں کے لوگ نہ صرف یہ کہ دین دار ہو گئے بلکہ دین کے داعی و علمبردار بن گئے، حضرت مولانا باندویؒ کا یہی دینی و دعوتی جذبہ " دارالعلوم الاسلامیہ (بستی)" کے قیام کا بھی باعث و محرک بنا جسکی تفصیلات آگے پیش کی جا رہی ہیں۔

۱۹۷۹ء کے شروع میں حضرت قاری صاحبؒ مرادآباد کے کسی مدرسے کے جلسے میں تشریف لائے، تو حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہ سے خاص تعلق ہونے کے سبب مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں بھی تشریف لائے، اور حضرت مولانا مدظلہ کے ساتھ مجھے اور چند اور احباب کو بلا کر حضرت مولانا کو توجہ دلائی کہ بستی شہر میں آپ حضرات ایک دینی ادارہ ضرور قائم کریں، آپ لوگوں میں صلاحیت بھی ہے اور آپ کے وطن میں اس کی ضرورت بھی ہے۔

حضرت مولانا نے اسباب و وسائل کی کمی اور موجودہ مصروفیات کی تفصیل حضرت قاری صاحبؒ کے سامنے رکھی تو حضرت قاری صاحبؒ نے فرمایا کہ: "گھبرانے کی بات نہیں ہے، آپ ارادہ کریں، میں بھی اپنے طور پر کوشش کرونگا"۔

چنانچہ حضرت والا کا یہی مشورہ بستی میں دارالعلوم الاسلامیہ کے قیام کا محرک بن گیا، اسباب و وسائل کی کمی کے سبب شہر سے متصل سول لائن کے علاقے میں ایک قطعہ اراضی خرید کر تعلیمی کام شروع کر دیا گیا، اور پھر وسط شہر میں ایک مکان اور کچھ زمین خرید کر تعمیری کام شروع کر دیا گیا، جس نے بحمداللہ موجودہ دارالعلوم کی شکل اختیار کر لی، ۱۹۷۹ء کے اخیر میں مدرسہ کی بنا پڑ چکی تھی اور ۱۹۸۰ء میں باضابطہ کام شروع ہو گیا، مگر سال ڈیڑھ سال بعد ہی ۱۹۸۲ء میں کچھ نادان

و مفاد پرست مقامی مسلمانوں کو سنگھ پریوار کے لوگوں نے بہکاوے میں لیکر ایک خطرناک سازش کے تحت مقامی عدالت میں مدرسہ کے خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا اور تعمیرات پر اسٹے حاصل کر کے مدرسہ کی رقوم کو بھی منجمد کرا دیا، حضرت قاری صاحبؒ نے اس مرحلے پر مدرسہ کیلئے بہت دعائیں کیں، اور کارکنوں کی ہمت بندھائی، خرید کردہ زمین پر ایک پرانی بلڈنگ تھی، جس پر ایک مسلم نیتا قابض تھے، حضرت قاری صاحبؒ نے ان سے ذاتی طور پر سفارش کی، اور سفارشی خطوط بھی لکھے جس کے نتیجے میں بحمداللہ مدرسہ کا وہ مکان خالی ہوگیا، اور قاری صاحبؒ اس کا شکریہ ادا کرنے ان کے مکان پر گئے، جس سے وہ اور ہم سب بہت متاثر ہوئے، ۹۲ء میں بالآخر مدرسہ کو ہائیکورٹ سے کامیابی ملی اور اسٹے ختم ہوا۔

حضرت قاری صاحب دارالعلوم الاسلامیہ کے قیام کے اصل محرک بھی تھے اور مجلس شوریٰ کے سرپرست، اور باضابطہ رکن بھی، اسوجہ سے حضرت کو اس ادارہ سے قلبی ربط و تعلق تھا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت والاؒ نے مشرقی یوپی کا کوئی سفر کیا ہو اور دارالعلوم الاسلامیہ میں تشریف نہ لائے ہوں، ان سے دارالعلوم جب بھی تشریف آوری کی درخواست کی گئی، تو حضرت تشریف لے آئے، اور اپنے مفید مشوروں سے مدرسہ کو نوازا۔

حضرت قاری صاحبؒ نے کارکنانِ دارالعلوم الاسلامیہ کی درخواست پر دارالعلوم کے لئے ایک عمومی اپیل جاری فرمائی جو حضرت ہی کے الفاظ میں درج کی جارہی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

معزز حضرات۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اللہ پاک نے اپنے کرم سے ہمارے مشرقی اضلاع میں مسلم آبادی

اور یہاں کے حضرات کے اندر جو صلاحیت اور بیداری مذہبی علاقوں میں ہے وہ دوسرے مقامات کے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

معزز حضرات! یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اللہ پاک نے ہمارے صوبہ یوپی کے مشرقی اضلاع میں اعظم گڈھ اور بستی کے حضرات کے اندر جو صلاحیت اور بیدار مغزی عطا فرمائی ہے، وہ دوسرے مقامات کے لوگوں کو نصیب نہیں۔ لیکن اس کا بھی اعتراف ہے کہ اس ملک میں اسلام کی جڑوں کو مضبوط کرنے والے مغربی اضلاع کے بوریہ نشینوں اور مجاہدین کی ایک جماعت تھی جنکی قربانی اور محنت سے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور جیسے مرکز وجود میں آئے، جنکے طفیل ملک کے گوشہ گوشہ میں دین کی روشنی پھیلی، ان کے ایثار ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جو جامعیت اور مرکزیت ان دونوں اداروں کو حاصل ہوئی وہ کسی ادارے کو نصیب نہیں۔

ضرورت تھی کہ انہی اسلاف کو نمونہ بنا کر ملک کے مختلف علاقے میں ایسے مرکز قائم کئے جاتے، ایک مرتبہ ضلع بستی کے چند مخلص اور باصلاحیت احباب ایک مجلس میں جمع تھے جنکی دینی خدمات کو ملک اور بیرون ملک میں سراہا جارہا ہے، ان سے احقر نے درخواست کی کہ اگر آپ حضرات توجہ فرمادیں، تو بستی دین کا بڑا مرکز بن سکتا ہے، یہ بات ان کے دل میں کچھ اس طرح بیٹھی کہ اسی وقت سے اس کے لئے جد وجہد شروع کردی، اور ایک بڑے ادارے کے قیام کا فیصلہ فرمالیا۔

ان کے اخلاص کی برکت سے کچھ اہل خیر حضرات کو اللہ پاک نے اس طرف متوجہ فرمایا، اور ایک بڑی رقم صرف کرکے ایک وسیع زمین اس کیلئے خرید لی گئی ہے اضرورت ہے کہ جلد ہی اس کی تعمیر شروع ہوجائے۔

دعا ہے اللہ پاک ہر اعتبار سے اس میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے

اور تمام مسلمانوں کو اس میں اپنی وسعت کے مطابق حصہ لینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

احقر صدیق احمد غفرلہٗ

خادم جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ (یوپی)

دارالعلوم الاسلامیہ کے قیام و استحکام کے سلسلے میں حضرت قاری صاحبؒ نے جو مفید اور قیمتی مشورے دیئے اس کا اندازہ حضرت مولانا باقر حسین صاحب مدظلہٗ صدر دارالعلوم کے نام انکے ذیل مکتوب سے ہو سکتا ہے جسے بجنسہٖ درج کیا جا رہا ہے

[illegible]

۴۸۶

مکرم بندہ زید کرمکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ- خدا کرے خیریت ہو!
احقر اس سال بہت مشغول رہا، دو ماہ سے اور اضافہ ہو گیا، مدرسہ کے کاموں

کیسا تھا مجھے مدرسہ اور دیگر دینی کاموں کے سلسلے میں اسفار بھی بہت کرنے پڑتے ہیں، تقریباً ایک ماہ سے یہ سلسلہ ہے کہ دن میں اسباق اور مدرسہ کا کام کرتا ہوں شام کو سفر کرتا ہوں صبح جلد ہی واپس ہوتا ہوں، اسی وجہ سے آپ کے جواب میں تاخیر ہوئی، یہ عریضہ بحالت سفر ہی لکھ رہا ہوں، مدرسہ کا پیڈ ساتھ میں نہیں ہے، آپکی صلاحیت اور محنت کو دیکھتے ہوئے احقر نے یہ مشورہ دیا تھا، آپنے اسکو قبول کرلیا، اور اس سلسلے میں جدوجہد فرمائی، اللہ پاک نے آپ کے اخلاص کی برکت سے یہ نصرت فرمائی، اخلاص کا یہ ثمرہ ہے، خدا کرے یہ آخر تک باقی رہے بندہ اسباب کا محتاج ہے، آپ نقشہ تیار کرا کر ان حضرات کے پاس ضرور بھیجدیں۔

تعمیر سے پہلے تعلیمی کام شروع کر دیا جائے، خواہ چھپر ڈال کر ہی فی الحال کام کرنا پڑے، بہت سے مقامات کے بارے میں علم ہوا کہ دس سال سے عمارت تیار ہو رہی ہے، جب ساری عمارتیں تیار ہو جائیں گی اسوقت کام شروع کیا جائے گا، یہ طریقہ اچھا نہیں ہے، نہ ہمارے اسلاف کا یہ طرز رہا ہے۔ آپ حضرات کام شروع کر دیں، اللہ پاک کی نصرت رہے گی، انشاء اللہ تمام مقاصد پورے ہوں گے۔

احقر آپ حضرات کا خادم ہے، سرپرستی کی صلاحیت بالکل نہیں اس کیلئے تو کسی بڑی ہستی کا انتخاب کیا جائے، احقر خدمت کیلئے تیار ہے، اور اسمیں اپنی سعادت سمجھتا ہے، ادھر کے کاموں کی مشغولی کی وجہ سے دوسری جگہ کا سفر بہت کم ہوتا ہے مولانا فاروق صاحب کو آپ خط لکھدیں کہ تعلیمی کام بھی کرتے رہیں۔

رجب اور شعبان میں تو احقر کو دم مارنے کی بھی فرصت نہیں رہتی، مرادآباد کی مجلس شوریٰ میں حاضری نہ ہو سکے گی، احقر تمام بچوں کیلئے دعاء صحت

کر رہا ہے

دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے سلسلے میں آپ نے جو تحریر طلب کی ہے، ابن وقت تو سادہ سے ہی کاغذ پر بھیج رہا ہوں، اگر ضرورت ہو تو مدرسہ کا کہ پیڈ پر بھی تحریر کر کے بھیج دونگا، مولانا معین الدین و دیگر اساتذہ کی خدمت میں سلام عرض کر دیں، فریدی صاحب سے ملاقات ہو تو ان سے بھی سلام عرض کر دیں، غالباً وہ مجھ سے ناراض ہیں، اس لئے خط کا جواب نہیں تحریر فرمایا، میں انتہائی مجبوری کی وجہ سے میرٹھ ان کی فرمائش کے باوجود حاضر نہ ہو سکتا تھا۔

احقر صدیق احمد غفرلہٗ

خادم جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ

دارالعلوم الاسلامیہ سے متصل مسجد محلہ دریاخاں پر ناجائز قبضہ و تسلط کیلئے بدعتیوں نے سنگھ پریوار کے ساتھ مل کر جو خونی ڈرامہ کھیلا، نمازیوں پر شب خون مارا، اور مسجد میں غنڈہ گردی کی، اور مقامی انتظامیہ کو غلط فہمی میں ڈال کر دارالعلوم کے ذمہ داروں کو مختلف جھوٹے مقدمات میں پھنسا دیا، تو ایسے نازک مرحلے پر جن علماء و مشائخ اور زعمائے نے کارکنانِ دارالعلوم کی ڈھارس بندھائی ان کیلئے اضطراری دعائیں کیں، اور اپنے مقام و مرتبہ اور مزاج و مسلک کے برخلاف حکام اور متعلقہ افسران تک اہل دارالعلوم کی صفائی دی، اور ان کے لئے کھل کر سفارش کی، اور اسے اپنا ذاتی مسئلہ بنالیا، اور اپنے بعض اہل اقتدار اعزہ سے ترک تعلق کر لیا، ان میں حضرت قاری صاحبؒ کی ذات والاصفات سب سے آگے تھی، اور اس طرح انھوں نے دین کی خدمت کیلئے بے نفسی و بے غرضی، خود فراموشی اور خاکساری و تواضع، اور اس کیلئے ہمہ جہتی جدوجہد کی جو اعلیٰ مثال قائم کی وہ ان جیسے ہی اللہ والوں کا حصّہ رہا ہے۔

باسمہ تعالیٰ

مکرمی زید کرمکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

خدا کرے آپ بعافیت ہوں!

جناب مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہ العالی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں مولانا ہمارے ملک کے نامور عالم ہیں، دین کے بہت سے کام مختلف مقامات پر کر رہے ہیں، ادارے قائم کر رہے ہیں، ان کے اخراجات کا انتظام کر رہے ہیں، بہت سے رفاہی کام کر رہے ہیں، بڑی خصوصیات کے حامل ہیں۔

ایک مسجد کے سلسلے میں کچھ لوگ کئی ماہ سے پریشان کر رہے ہیں، حالانکہ اس مسجد کا کئی سال سے مولانا ہی انتظام کر رہے ہیں، ابھی حال ہی میں کئی لاکھ روپیہ خرچ کر کے از سر نو تعمیر کرائی ہے، اسی وقت سے کچھ شر پسند لوگ سر اٹھائے ہوئے ہیں، اور قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ جناب والا کو فکر ہے، اور اس سلسلے میں تعاون فرما رہے ہیں جناب سے گذارش ہے کہ اس وقت مخالفین بہت زور لگا رہے ہیں، حکومت کے کچھ لوگ انکی حمایت کر رہے ہیں، آپ حضرت مولانا کا پورا تعاون فرمائیں، اللہ پاک اس کا بہتر اجر دارین میں عطا فرمائے۔

صدیق احمد غفرلہٗ

جامعہ عربیہ ہتھورا (باندہ)

۲۷ ذوالحجہ ۱۴۱۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزم محمد نسیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حامل رقعہ ہٰذا جناب مولانا باقر حسین صاحب مدظلہٗ ہمارے ملک کے معزز علماء میں ہیں، بیرونِ ممالک میں بھی انکی شہرت ہے، دین کا بہت کام کر رہے ہیں بڑے بڑے ادارے قائم کئے ہیں بڑی خصوصیات کے حامل ہیں، انکے مخالفین نے پولیس میں انکی رپٹ کر دی ہے، اسکی تفصیل آپ سن لیں، اور ہر طرح کا تعاون کریں، محض فرضی اور سراسر جھوٹ رپٹ ہے۔

آپ جلد ہی ان کا نام خارج کرائیے، اور جو کچھ آپ کر سکتے ہوں، اسمیں ذرا بھی دریغ نہ کیجئے، انکی دعا سے انشاء اللہ آپ بہت کچھ ترقی کریں گے!

صدیق احمد غفرلہٗ

S[illegible] Ahmad Bandvi　　　　صدیق احمد باندوی

Jami[illegible] Arabia Hathora-Banda　　　　جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ

U. P.—INDIA　　　　یو پی ۔ ہند

Phone 81459　　　　فون ۔ ۸۱۴۵۹

عزیزم نسیم [illegible]　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اگر اس میں کچھ تاخیر ہو تو سی آئی ڈی انکوائری کرا دی جائے

(۲) سی۔ او سٹی ایم ایم بیگ (جو اصل فتنہ ہے) کا تبادلہ کرایا جائے۔ انہوں نے ایف آئی آر مولانا وغیرہ کے خلاف اپنی وجاہت کی بنا پر لکھوائی ہے [illegible]

(۳) مسجد کے سابقہ حالات [illegible] بحال کرائی جائیں

(۴) [illegible]

[illegible]

عزیزم نسیم الدین صدیقی سلمہٗ　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بستی کے حالات کا آپکو علم ہے، میں نے زبانی بھی بیان کیا تھا، آپکے کہنے کے مطابق مولانا باقر حسین صاحب، مفتی شکیل احمد صاحب وغیرہ رام پرشاد صاحب سے مل چکے ہیں، آپ سے غلط بیان کیا گیا کہ وہ ملتے نہیں جاتے نہیں، رام پرشاد صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ میں بستی آؤں گا تو دارالعلوم بھی پہونچوں گا، مگر وہ بستی گئے کئی روز قیام کیا اور دارالعلوم نہیں گئے، ان سے ایک وفد بھی مل چکا ہے، اس وفد سے بھی رام پرشاد صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ میں دارالعلوم کے خلاف کوئی اقدام نہ کروں گا، اس کے باوجود وہ فریق مخالف کی مدد کر رہے ہیں، اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ امور مندرجہ ذیل کے سلسلے میں کوشش کریں۔

(۱) مولانا باقر حسین صاحب، مولانا ظہیر انوار، مولانا اسعد کے اوپر لگائے گئے فرضی سنگین دفعات ختم کئے جائیں، اگر اس میں کچھ تاخیر ہو تو سی، آئی، ڈی انکوائری کرادی جائے۔

(۲) سی، او، سٹی۔ ایم ایم بیگ (جو اصل فتنہ ہے) کا تبادلہ کرایا جائے، اسی نے ایف، آئی، آر مولانا وغیرہ کے خلاف اپنی وجاہت کی بناء پر لکھوائی ہے

اور بالکل جھوٹ لکھوائی ہے۔

(۳) مسجد کے سابقہ حالات جو ۶ر۲ر۱۹۸۰ء کو تھے بحال کئے جائیں۔

(۴) سالہا سال سے دار العلوم کا امام نماز پڑھاتا رہا اور نظم و نسق دار العلوم کرتا رہا وہ بحال کیا جائے۔

احقر صدیق احمد غفرلہٗ
جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ
۵ رمئی ۹۷ء

باسمہٖ سبحانہٗ
صدیق احمد باندوی Siddiq Ahmad Bandvi
جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ Jamia Arabia, Hathaura-Banda
یوپی ۔ ہند U. P.—H I N D
فون ۸۱۴۵۹ Phone : 81459

عزیزم [illegible] الرحمٰن صاحب السلام علیکم

جناب مولانا [illegible] بستوی اور ان کے رفقاء کے ساتھ جو معاملہ کیا جا رہا ہے اس سے میں نے آپ کو مطلع کر دیا ہے وہاں جو تشدد ہو رہا ہے۔ اور یہ دو [illegible] بار بار [illegible] اپنے مسلک کی بنا پر ساتھ دے رہے ہیں اور [illegible] کے ذریعے بھی [illegible] سے اسی طرح واقف ہوں گے معلوم ہے کتنا کام کیا اور کتنا کام کر رہے ہیں

آپ سے درخواست ہے کہ [illegible] نگرانی رکھیں تاکہ انھوں نے مسجد [illegible] اور [illegible] اس سے [illegible] کر رہے ہیں پہلے کسی کو

[illegible] سے ہر جگہ مسجدوں پر قبضہ کر رہے ہیں یہ لوگ جگہ جگہ [illegible]
قبضہ کر رہے ہیں ان کی اسکیم یہی ہے ہر جگہ فتنہ کھڑا کر رہے ہیں
آپ جلد ہی اس سی اور [illegible] کا تبادلہ کرا دیں اور بے خوف و خطر آپ
حق کا ساتھ دیں ناحق سے متاثر نہ ہوں آپ کا کوئی کچھ نہ کر سکے گا
آپ وزیر اعلیٰ کو سمجھا دیں کہ یہ فتنہ لوگ ہیں ہر جگہ اسکیم کا جھگڑا
کر رہے ہیں [illegible] آپ خدا کے واسطے کام کریں اللہ پاک
آپ کا ساتھ دے گا۔

[illegible]

عزیزم نسیم الدین سلمہٗ　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

جناب مولانا محمد باقر صاحب بستوی اور انکے رفقاء کے ساتھ جو معاملہ کیا جا رہا ہے، اس سے میں نے آپکو مطلع کر دیا ہے، وہاں جو بیگ صاحب سی، او- ہیں وہ مخالف پارٹی کا محض اپنے مسلک کی بنا پر ساتھ دے رہے ہیں، اور مولانا باقر صاحب کی توہین کے درپے ہیں، میں مولانا سے اچھی طرح واقف ہوں کہ انھوں نے کتنا کام کیا، اور کتنا کام کر رہے ہیں، آپ سے ملاقات ہوگی تو میں پوری تفصیل بیان کرونگا، کافی رقم لگا کر انھوں نے مسجد بنوائی اور مخالفین اس پر قبضہ کر رہے ہیں پہلے کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ مسجد کو آباد کرتے، یہ لوگ جگہ جگہ مساجد اور مدارس پر قبضہ کر رہے ہیں، انکی اسکیم یہی ہے، ہر جگہ فتنہ کھڑا کر رہے ہیں، آپ جلد ہی اس سی، او- کا تبادلہ کرا دیں، اور بے خوف و خطر آپ حق کا ساتھ دیں، ناحق سے متاثر نہ ہوں، آپ کا کوئی کچھ نہ کر سکے گا، آپ وزیر اعلیٰ

کو سمجھا دیں کہ یہ تین لوگ ہیں ہر جگہ اسی قسم کا جھگڑا کر رہے ہیں، آپ خدا کے واسطے کام کریں، اللہ پاک آپ کا ساتھ دے گا۔

صدّیق احمد غفرلہٗ

امانت کو ہم غنیمت سمجھتے ہیں

وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَا اُؤْتُمِنَ: امانت ادا کرے، آج یہ وصف ختم ہو گیا، امانت کو ہم غنیمت سمجھتے ہیں، کسی کی زمین ہمارے نام آگئی تو ہڑپ کر جاتے ہیں، میراث جس طرح تقسیم ہونی چاہئے، نہیں ہوتی، ہمارے علاقے میں لڑکے سب آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، لڑکیوں کو نہیں دیتے، کسی کو میراث سے محروم کرنا بھی امانت میں خیانت ہے، اس سے جتنا بھی خرچ کریں، ہر سال حج کریں بیکار، مسئلہ یہ ہے کہ مرنے والے کے مال میں تقسیم سے پہلے کوئی بھی تصرف ناجائز ہے، حالانکہ اس سے پہلے ایک سوئی بھی اِدھر کی اُدھر نہیں کر سکتے، بہت سی جگہ تو ایسی رسمیں ہیں کہ اِدھر مرا، اُدھر تیسرے دن دیگیں چڑھتی ہیں، اور اب تو شادی کی طرح کارڈ چھپتے ہیں، اور کھانے والے کارڈوں پر آتے ہیں، ایک تو تقسیم نہ کرنے کی وجہ سے حرمت، دوسرے کھانے والے کھا رہے ہیں، اور غرض ہے ایصالِ ثواب کی، سوچو تو ثواب ملے گا بھی؟ جب طریقہ صحیح نہیں، تو کیا ایصالِ ثواب!

(از: عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی صاحب نور اللہ مرقدہٗ)

حضرت باندوی کا تعلیمی عہد

از ــــــ مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی
استاذ حدیث جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ

حضرت باندوی علیہ الرحمہ نے اپنے تعلیمی سلسلہ کو کئی مرحلوں میں مکمل کیا جسکی مدت تقریباً بیس سال کے عرصہ کو محیط ہے۔ آغاز تین چار سال کی عمر سے الف، باء اور گاؤں و گھر سے کیا، اور اختتام مرادآباد میں معقولات کی انتہائی تعلیم پر ہوا، جبکہ حضرت اپنی عمر کی تیسری دہائی میں داخل ہو چکے تھے۔

تعلیم کا آغاز

یہ بات تو معلوم و معروف ہے کہ ذی حیثیت خاندانوں میں تعلیم کا اہتمام ہمیشہ رہا ہے، البتہ یہ اہتمام اور اس کا رخ وقت اور علاقہ کے حالات، نیز خاندانی حیثیت و نوعیت کے اعتبار سے مختلف رہا ہے۔ حضرت مولانا کا خاندان بندیل کھنڈ کا ایک ذی حیثیت اور علم و عمل دونوں ہی میں امتیاز کا حامل خاندان تھا، اس لئے اس خاندان کے افراد جہاں جہاں بھی آباد تھے کچھ نہ کچھ علم کی روشنی انکے پاس ضرور رہتی، اور اس کی سعی و فکر انہیں پائی جاتی تھی، حضرت کے خاندانی احوال سے اس کا علم ہوتا ہے۔ البتہ ہتھورا میں اور بالخصوص حضرت کے گھرانہ و شاخ میں کچھ زیادہ ہی اسکی طرف توجہ تھی،

اور یہ دراصل حضرت محدث پانی پتی قاری عبدالرحمن علیہ الرحمۃ کا فیض تھا، کیونکہ ہتھورا کے حضرات کا ان سے خاص قرب و ربط اور تعلق تھا۔

اس کیلئے گھروں میں انفرادی نظام کے ساتھ گاؤں میں یکجائی و اجتماعی نظام بھی مکتب کی صورت میں پایا جاتا تھا۔

ہتھورا و باندہ

حضرت کی تعلیم کا آغاز اپنے گھر اور گاؤں سے ہوا، اور پہلا مدرسہ گھر تھا، اور اس مدرسے کے معلم دادا تھے اور پھر والدہ اور اس کے بعد پھر گاؤں کا مکتب، اور معلم خاص مولانا امین الدین صاحب تھے جو ہتھورا ہی کے رہنے والے اور رشتہ میں حضرت علیہ الرحمۃ کے ماموں تھے۔

ناظرہ کی تکمیل اور حفظ

پانچ سال کی عمر میں حضرت نے ناظرہ قرآن مجید مکمل فرمایا، ناظرہ مکمل کرنے کے بعد حفظ شروع کیا دادا صاحب چونکہ اچھے قاری تھے اس لئے خود انھوں نے خصوصی دلچسپی لی لیکن حضرت نے ابھی آٹھ ہی پارے انکی نگرانی میں مکمل کئے تھے کہ حضرت انکی سرپرستی سے محروم ہو گئے، چونکہ اس عرصہ میں مولانا امین الدین صاحب تعلیم و تدریس کی غرض سے ہتھورا میں قیام پذیر ہو چکے تھے، اسلئے پھر انہیں کے پاس حفظ کی تکمیل میں لگے، اور بالآخر بلوغ سے قبل ہی حفظ کو مکمل کرنے کی سعادت حاصل کی حفظ میں تین سال لگے، درمیان میں کچھ تعطل رہا، کوئی باقاعدہ استاذ نہیں مل رہا تھا، حفظ کے ابتدائی دور میں دادا صاحب نے بہتر و منظم طور پہ تعلیم دلانے کے لئے یہ ارادہ کیا، کہ حضرت کو مودہا ہمیر پور میں داخل کردیں، چنانچہ خود لے کر گئے، ایک ہفتہ رہے، جائزہ لیا، مگر اطمینان نہ ہونے پر واپس لے آئے اور خود ہی تعلیم کا کام کرتے رہے اور یوں تو پورے قرآن مجید کا حفظ بہت پختہ تھا، لیکن فرمایا کرتے تھے کہ دادا صاحب کی برکت سے خود ان سے حفظ کئے گئے

آٹھ پارے ہمیشہ نوک زبان رہے۔

تکمیل اور پہلی محراب حفظ مکمل کرنے کی صورت بھی کچھ اس طرح بنی کہ ابھی کچھ حصہ باقی تھا کہ رمضان آگیا، اور اسی میں سنانے کی بات ہوگئی تو جو کچھ حفظ کرچکے تھے اسکو سنا لینے کے بعد باقی کو یاد کرکے تراویح میں سنادیا، اور اس طرح رمضان میں اور تراویح میں سناکر حفظ کو پورا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، آغاز حفظ سورۂ ق سے کیا تھا، آخر میں ۲۶واں پارہ رہ گیا تھا جس کو رمضان میں یاد کرکے مکمل کیا، یہ حضرت کی پہلی محراب تھی جس کے بعد کوئی رمضان اللہ کے فضل سے خالی نہ گیا، ایک محراب دو دو تو ضرور سنایا، اور پہلی محراب حضرت نے بلوغ سے قبل ہی ۱۲-۱۳ سال کی عمر میں مدنپور (نزد جیلالولی) میں سنائی، اور محراب سنانے کے بعد پھر دور کی نوبت آئی، اور خصوصیت سے پانی پت میں سنانے کا سلسلہ رہا۔

اُردو دینیات و حساب ظاہر ہے کہ ناظرہ و حفظ کی تعلیم کے دوران صرف قرآن مجید کی تعلیم پر اکتفا نہیں تھی، بلکہ ساتھ ساتھ اردو لکھنا و پڑھنا بھی جاری تھا، بظاہر اسی عہد میں حضرت نے اپنے خط و تحریر کو درست فرمایا، بہت اچھا خط تھا، ادھر کثرت تحریر اور سرعت تحریر کیوجہ سے خط بدل گیا تھا، حضرت کے خط و تحریر کے بہت سے نمونے موجود ہیں، اعلانات آپ دست مبارک سے، اور بانس کے قلم سے تحریر فرماتے رہے، کچھ ہندی بھی پڑھی اور حساب بھی، مدرسہ کے ابتدائی عہد میں امور مدرسہ کا اندراج خود فرماتے رہے اور حساب بھی خود ہی لکھتے رہے۔

فارسی اور ابتدائی عربی حفظ سے فراغت کے بعد فارسی کی تعلیم شروع ہوئی اور رواج اور اس عہد کے مزاج کے مطابق فارسی

کی کافی تعلیم حاصل کی، نیز عربی کی ابتدائی کچھ کتب بھی پڑھیں، اور یہ مرحلہ حضرت نے ہتھورا میں اور کچھ باندہ میں بھی طے کیا، اور اس کے طے کرانے میں مولانا امین الدین صاحب کے ساتھ باندہ میں مقیم بعض دوسرے حضرات کی بھی شرکت رہی، جن سے مولانا کے روابط و تعلقات تھے، مثلاً مولانا عبدالرحمن صاحب الہ آبادی، اور مولوی فضل الدین صاحب، اس سلسلہ میں ہتھورا سے متصل گاؤں "ددوا" کے ایک کائستھ کا بھی حضرت تذکرہ فرمایا کرتے تھے، جن کا آنا جانا ہم لوگوں کے سامنے بھی رہا ہے، اور ان کے آنے پر ہی حضرت کی زبان مبارک سے یہ سنا گیا، انھوں نے خود حضرت کے گھر کے لوگوں سے پڑھا تھا۔

باندہ باہر کا سفر کرنے سے قبل حضرت کی تعلیم کا سلسلہ اصلاً ہتھورا ہی میں رہا باندہ کی کچھ صورت جو بنی تو یوں کہ حضرت مولانا امین الدین صاحبؒ حضرت پانی پتیؒ کے سلسلہ سے تعلق و تلمذ رکھتے تھے جس کا خاص حلقہ شہر باندہ بھی تھا، اور مولانا مزاجاً نقل و حرکت سے کام کیا کرتے تھے، اس کی وجہ سے وہ برابر باندہ تشریف لے جاتے، اور وہاں قیام بھی فرماتے، حضرت کے تعلیمی عہد میں جب وہ باندہ تشریف لے جاتے، تو حضرت بھی ساتھ ہوتے، اور اس طرح باندہ جانے کی وجہ سے حضرت کا تعلیمی سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا، اور باندہ قیام ہوتا تو وہاں کے اہل علم سے استفادہ کا موقع ملتا، مزید برآں باندہ میں مولانا امین الدین صاحب کی مجلس لگتی تھی، حضرت اس سے بھی خوب مستفید ہوتے۔

علمی لگن کچھ تو دادا صاحبؒ کی توجہ و تربیت، اور کچھ مشیت ایزدی، اور ذہنی صلاحیت بچپن ہی سے حضرت کے اندر علم کی ایک خاص لگن و طلب پائی جاتی تھی، اسی لئے تعلیم کے جو مرحلے گھر رہ کر ممکن تھے، وہ بہت تیزی سے طے کئے، اور اسی لئے مولانا امین الدین صاحب کیساتھ مستقل لگے

رہے، سفر و حضر دونوں میں مولانا امین الدین صاحب اپنی صلاحیتوں کے مطابق حضرت کو سیراب کرتے رہے، اپنے شاگرد عزیز کی پیاس کو مزید بڑھاتے اور طلب کو تڑپ سے بدلنے کی کوشش کرتے رہے، بالآخر انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اب تو جو کچھ میرے پاس تھا میں نے تم کو دیدیا اب آگے جاؤ!

پانی پت کیلئے فرار

خاندان میں اگرچہ تعلیم کا رواج تھا، مگر بس بقدر ضرورت، اعلیٰ دینی تعلیم کا رواج و مزاج نہ تھا، دادا صاحب جو ذوق رکھتے تھے وہ رہ نہیں گئے تھے کہ حضرت کی اعلیٰ تعلیم میں دلچسپی لیتے، گھر میں بات آنے پر مخالفت ہی ہوگئی، تو حضرت نے اپنے ایک حقیقی چچا زاد بھائی کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بنایا، یہ بھائی عمر میں حضرت سے کچھ بڑے تھے، مگر ہمجولی تھے، ساتھ رہنا سہنا ہوتا تھا، ایک دن دونوں پانی پت کے سفر کے ارادے سے گھر سے فرار ہو گئے، مگر باندہ پہونچ کر کچھ توقف کیا، اور تلاش کرنے والوں نے وہاں انکو پالیا، واپس لے آئے، مگر اب تو دھن کچھ اور ہو چکی تھی، رات و دن رونا دھونا ہوتا، بالآخر مشورہ ہوا کہ پانی پت تو دور ہے کانپور میں داخل کر دیا جائے۔

کانپور

چنانچہ آپ کو بغرض تعلیم کانپور پہونچا دیا گیا، اس وقت حضرت کی عمر ۱۵ سال تھی، کانپور میں اس وقت دو مدرسے مشہور تھے، ایک جامع العلوم پٹکاپور، اور دوسرا مدرسہ تکمیل العلوم جس کے بانی حضرت مولانا سعید احمد لکھنوی تھے، حضرت کا داخلہ تکمیل العلوم میں ہوا مگر وہاں کے تعلیمی نظام سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے تین ماہ بعد جامع العلوم میں داخلہ لے لیا، جو حضرت کی قیامگاہ بختو جراح کی مسجد پٹکاپور سے قریب بھی تھا، تقریباً ڈیڑھ سال کانپور میں قیام رہا، اس عرصہ میں عربی کی، اور

درس نظامی کے نصاب کی ابتدائی کتابیں آپ نے پڑھیں، مثلاً نحومیر و میزان سے اور منیۃ المصلی وغیرہ، فارسی کی اونچی کتب بھی پڑھیں۔

جامع العلوم کے اساتذہ میں مولانا سہراب علی صاحب بستوی، مفتی صدرالدین اور مولانا کمال الدین صاحب سے پڑھا، اور تکمیل العلوم میں مولانا سعید احمد لکھنوی سے، ان دنوں جامع العلوم میں دورہ کے ایک متین و باصلاحیت طالب علم مولانا محمد یونس صاحب (ساکن سیتامڑھی بہار) تھے ان سے حضرت تعلیم و کتابوں کے سلسلہ میں مدد لیا کرتے تھے، اس لئے انکو بھی اپنا استاد فرمایا کرتے تھے۔

اجمیر اندازہ یہ ہے کہ تکمیل العلوم سے آجانے کے باوجود حضرت علیہ الرحمۃ کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے، اور کچھ بعض اونچی جماعتوں کے مانوس طلبہ کی ترغیب و تحریض کہ دوسری جگہ بہتر ہے۔ آخر کانپور چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا، اور فرخ آباد کے ایک طالبعلم اختر حسین نامی کے ساتھ اجمیر کا رخ کیا۔

اس زمانے میں وہاں مولانا معین الدین صاحب کا مدرسہ معروف تھا، اور ان کا چرچا تھا، اختر صاحب نے وہاں سے خط و کتابت بھی کرلی تھی، مگر جواب دراصل دھوکہ دہی پر مشتمل تھا، مولانا اجمیری ان دنوں شدید بیمار اور صاحب فراش تھے کسی نے اپنے طور پر جواب دیدیا تھا، یہ دونوں حضرات وہاں پہونچے تو صورتحال سامنے آئی، اور مولانا اجمیری صاحب نے معذرت کی، وہاں کچھ لوگوں نے چاہا کہ حضرت تو رک ہی جائیں، کم عمر ہیں مولانا کے گھر کا کام بھی دیکھ لیا کریں گے مگر انھوں نے معذرت کی، اور کشش انھیں کی تھی، چند دن کے بعد براہ دہلی پانی پت کا قصد کیا، دہلی پہونچنے پر اختر صاحب تو دہلی کے ایک مدرسہ میں داخل ہوگئے، مگر حضرت آگے بڑھ گئے۔

پانی پت پانی پت سے حضرت کا ایک طبعی لگاؤ تھا، گھرانہ و خاندان میں علم

وعمل کی لائن سے جو کچھ تھا، وہ پانی پت کا فیض تھا، حضرت پانی پتیؒ کے بعد ان کے اخلاف کا گاؤں میں برابر آنا جانا تھا، اور ان کا صبح وشام چرچا و تذکرہ رہا کرتا تھا، بلکہ بعض حضرات کی ملاقات وزیارت کا شرف حضرت کو بھی حاصل تھا بچپن کے استاذ خاص اور مربی خاص مولانا امین الدین صاحب نے بھی وہیں سے سب کچھ حاصل کیا تھا، اور اپنے شاگرد رشید سے بھی کہا تھا کہ مزید طلب کیلئے پانی پت جاؤ۔

کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ قرآن کریم سے خاص تعلق وشغف تھا، دادا صاحب نے وہیں سے قرات کا فن حاصل کیا تھا، تو حضرت نے ان سے بھی بہت کچھ سنا ہوگا، اور پھر حضرت نے ایک خواب بھی دیکھا، دہلی کے زمانہ قیام میں کہ قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتیؒ نے کسی سے کہلایا "دہلی تک آگئے ہیں اور یہاں نہیں آئے" یہ چیزیں حضرت کو پانی پت کی طرف کھینچ رہی تھیں، کانپور آنے سے پہلے ایک مرتبہ وہاں کے ارادہ سے گھر سے بھاگے بھی تھے۔

پانی پت اس زمانے میں ایک بڑا علمی مرکز تھا بالخصوص حفظ وقرات کا حضرت خود فرماتے تھے کہ وہاں ڈھائی ہزار طلباء پڑھتے تھے، البتہ نظام اس وقت تک دارالعلوم دیوبند کی طرح باقاعدہ نہ تھا، بلکہ قدیم انداز پر تھا، طلباء مسجدوں میں رہتے اور گھروں سے کھانے کا نظام ہوتا یا اپنے طور پر۔

بہر حال حضرت پانی پت پہونچے، اور وہاں جم کر رہے تین سال قیام کیا اس عرصہ میں نصاب میں کافیہ تک کی تعلیم کا مرحلہ طے کیا، اور خصوصیت سے علوم قرات کی تکمیل وتحصیل کی، عربی نصاب کی تعلیم پوری اور معیاری تھی، کافیہ وتہذیب وغیرہ زبانی یاد کرائی جاتی تھی، سالانہ امتحان مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہاں پوریؒ نے لیا، بہت ہی متاثر ہوئے، اور تاثرات میں تحریر فرمایا کہ ایسی تعلیم تو دارالعلوم

دیوبند میں بھی نہیں ہوتی ۔

وہاں کے اساتذہ میں شیخ القراء حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب پانی پتیؒ اور حضرت محدث پانی پتیؒ کے پر پوتوں ۔ قاری عبد الحمید صاحبؒ او قاری عبد الحلیم صاحبؒ نیز مولانا فضل حق صاحبؒ قاری مشتاق صاحبؒ کا نام آتا ہے ۔ عربی کتب خصوصیت سے مولانا عبد الرحیم صاحبؒ سے پڑھیں ، جو از میزان تا بخاری اور از صبح تا شام مسلسل پڑھایا کرتے تھے ۔

شیخ القراء سے نیز مولانا عبد الحلیم صاحبؒ سے فن قرارت کی تکمیل و تحصیل کی اور دوسرے مولانا عبد الحمید صاحبؒ کو قرآن مجید اہتمام کے ساتھ سنایا ، شیخ القراء اور قاری مشتاق صاحبؒ کے یہاں مشق کا سلسلہ تھا ، اس سلسلہ میں حضرت محدث پانی پتی کی ایک پوتی کا تذکرہ بھی حضرت کی زبان مبارک سے سنا گیا ہے ، اور حضرت کے بیان کے مطابق خصوصیت سے سبعہ کی تعلیم کیلئے ہی پانی پت گئے تھے ، اور عربی کا نصاب اگرچہ اہتمام کے ساتھ پورا کیا ، مگر اس کی حیثیت ثانوی تھی ، اور عربی کتابیں پڑھنے والوں میں حضرت تنہا ہی سبعہ کے طالب علم تھے ۔

حضرت باندوی علیہ الرحمہ کا چونکہ پانی پت سے قدیم تعلق تھا اور حضرت محدث پانی پتی کے گھرانہ سے خاص قرب ! حضرت کے دادا نہ صرف یہ کہ پانی پت آتے جاتے تھے ، انہوں نے ایک عرصہ وہاں قیام بھی فرمایا تھا ، اسلئے حضرت پانی کے گھرانے کے لوگوں کی حضرت پر خصوصی نظر و شفقت تھی ، قیام بھی اسی گھرانے میں تھا ، اور اتفاق سے دو پوتوں میں سے انکے حصّے میں حضرت آئے تھے ، جن کے یہاں معاشی مشقت و تنگی کا معاملہ تھا ، برابر فاقہ رہا کرتا تھا ، یعنی مولانا عبد الحمید صاحب - مگر حضرت نے کبھی اظہار نہ کیا ، اور وہ حضرات خدمت کے ساتھ تربیت کی پوری فکر رکھتے تھے ، اور خفیہ نگرانی بھی کرتے تھے ۔

مظاہر علوم

کافیہ اور شرح جامی بحث فعل تک کی تعلیم کو مکمل کرنیکے بعد حضرت نے ملک کی مشہور درسگاہ مظاہر علوم کا قصد کیا اور ۱۳۵۸ھ میں وہاں داخلہ لیا۔ اور ۱۳۶۳ھ تک وہاں قیام اور تعلیمی سلسلہ رہا یعنی تقریباً پانچ سال کا عرصہ اور فراغت تک کا مرحلہ طے کیا۔ مظاہر میں شرح جامی کی جماعت میں داخلہ ہوا، جس میں شرح جامی کے ساتھ کنز و اصول الشاشی وغیرہ پڑھیں، دوسرے سال شرح وقایہ، نور الانوار و مختصر المعانی وغیرہ پڑھیں اور تیسرے سال ہدایہ اولین و جلالین وغیرہ پڑھیں، چوتھے سال مشکوۃ و بیضاوی کے ساتھ ہدایہ ثالث پڑھی، اور اگلے سال جو کہ پانچواں سال تھا، اس میں دورہ میں داخل رہے۔

اس زمانہ میں بخاری شریف اول، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور بخاری ثانی حضرت مولانا عبد اللطیف صاحبؒ کے پاس تھی، مظاہر کے اساتذہ میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت کے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحبؒ، مولانا عبد الرحمن صاحب کاملپوریؒ، مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ، مولانا منظور احمد خانصاحبؒ، مولانا امیر احمد صاحب کاندھلویؒ مولانا ظہور الحق صاحب دیوبندیؒ، نیز مفتی سعید احمد صاحب سہارنپوریؒ اور مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ کے اسمائے گرامی معروف ہیں۔

اس پانچ سال کے عرصہ میں کچھ وقت پانی پت میں اور کچھ مراد آباد میں بھی گذارا۔ پانی پت تو ہدایہ کے سال جانا ہوا تھا، اس موقع سے ہدایہ کے اسباق میں قاری فتح محمد صاحب کی معیت رہی کہ انھوں نے باقاعدہ نصاب بڑی عمر میں پورا کیا۔

مدرسہ شاہی مراد آباد

جس سال حضرت مشکوۃ پڑھ رہے تھے، بقرعید

سے کے بعد علالت کی وجہ سے، مظاہر علوم سے لمبا ناغہ ہوگیا، ضابطہ کے مطابق اب ترقی کا مسئلہ اہم تھا، اور آگے تعلیم جاری رکھنے کا، تو ششماہی کے موقع سے حضرت نے مدرسہ شاہی میں داخلہ لے لیا، اور اس سال کا سالانہ امتحان وہیں دیا، وہاں مشکوٰۃ کے ساتھ ہدایہ آخرین و ملا حسن وغیرہ بھی پڑھیں، اور اگلے سال شوال میں دورہ کی غرض سے دوبارہ داخلہ لیا، اور داخلہ ضوابط و شرائط کے مطابق باقاعدہ امتحان کے ذریعہ ہوا، یہ امتحان حضرت کے مرشد مولانا اسعد اللہ صاحب نے لیا، اور کامیابی حاصل ہوئی، مرادآباد کے اساتذہ میں مولانا انصار الحق مرادآبادیؒ، مولانا عجب نور صاحبؒ وغیرہ کا تذکرہ آتا ہے، نیز مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ کے بخاری کے سبق میں بھی بعد عصر شریک ہو جایا کرتے تھے، اور قاری عبدالرحمٰن صاحبؒ سے قراءت کی بھی تحصیل کی۔

دورہ کی تکمیل یہ تو طے ہے کہ شوال ۱۳۶۲ھ میں حضرت باندوی علیہ الرحمہ نے دورہ میں شرکت کیلئے مظاہر میں نیا داخلہ لیا، جس کی وجہ چند ماہ کی غیبت تھی، اور اس سال کے حضرت والا کے قریبی خصوصی رفقاء اور خود حضرت کے بیانات سے یہی مترشح رہا کہ حضرت نے دورہ وہاں مکمل فرمایا، جامعہ عربیہ ہتھورا میں جب دورہ کا آغاز ہوا، اور بخاری شریف جلد اول کا سبق حضرت سے متعلق کیا گیا، تو حضرت نے طلباء کے سامنے اپنی سند بیان فرمائی، جس میں مظاہر کے علاوہ کسی دوسرے ادارہ اور ان کے اساتذہ کا نام و تذکرہ نہیں فرمایا، احقر کے والد ماجد مولانا مرتضیٰ صاحبؒ بھی حضرت کے خاص رفقاء میں سے تھے، انہوں نے کوئی دوسری بات ذکر نہیں کی، ایک اور محب و رفیق حضرت مولانا عبدالوحید صاحب غازی پوری

بھی یہی فرماتے ہیں۔

البتہ بعض حضرات کا کہنا ہے، کہ دورہ کے سال شروع میں تو حضرت مظاہر رہے، مگر بعد میں کہیں اور چلے گئے تھے اور ایک اہم بات یہ ہے کہ مظاہر کے ریکارڈ میں ششماہی کے نمبرات تو درج ہیں مگر سالانہ کے نمبرات کا اندراج نہیں ہے۔ اور چونکہ حضرت مدرسہ فتحپوری دہلی میں تعلیم کا تذکرہ کیا کرتے تھے اس لئے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دورہ وہیں جاکر مکمل کیا ہے، اور بخاری علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی ؒ سے پڑھی ہے۔

احقر کو اب تک اس بات میں تامل ہے کہ حضرت نے دورہ مظاہر کے علاوہ کسی دوسرے ادارہ میں مکمل فرمایا ہے، اور اسکی کچھ تفصیل آئی ہے، مزید برآں یہ کہ تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مطابق علامہ بلیاوی علیہ الرحمۃ کا فتحپوری میں قیام دو مرحلوں میں ہوا، پہلا مرحلہ فراغت کے معاً بعد ۱۳۲۵ھ تا ۱۳۳۲ھ ہے جو حضرت کی طالب علمی کا عہد نہیں، اور دوسرا ۱۳۶۳ھ ۱۳۶۴ھ کا ہے، یہ حضرت کے دورہ و تعلیم کا سال ضرور ہے، مگر حضرت سے احقر نے خود یہی سنا و محفوظ کیا ہے، کہ دہلی کا قیام علامہ ابراہیم صاحب سے صرف معقولات پڑھنے کی غرض سے تھا اور مظفر پور سے واپسی کے بعد ریکارڈ میں نام کا نہ ہونا سہو بھی ہو سکتا ہے، اور اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت نے سالانہ امتحان نہ دیا ہو، ہاں تعلیم وہیں پوری کی ہو، اور تعلیم کے دنوں میں اخیر تک وہیں رہے ہوں، سند تو ایسے حضرات کے یہاں آج بھی مقصود نہیں، اس وقت کیا ہوتی، اور امتحان کیوں نہیں دیا، اس بابت کئی امور سامنے آئے ہیں، انشاء اللہ کسی موقعہ پر اس پر گفتگو آئے گی۔

معقولات کی انتہائی تعلیم اور تعلیمی سلسلہ کی انتہاء | حضرت باندوی علیہ الرحمہ کو حق

تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کی ذکاوت و فطانت سے نوازا تھا، اس لئے یوں تو پورے نصاب و نظام اور اس میں شامل علوم و فنون کے اندر بھی حضرت امتیازی نمبرات کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے رہے، لیکن ذکاوت کی وجہ سے علوم آلیہ نحو و صرف و معانی وغیرہ اور بالخصوص علوم عقلیہ سے خصوصی مناسبت اور دلچسپی رہی، اور خاص ذوق رہا، جس کا مظہر اکمل تسہیل المنطق، شرح سلم اور شرح تہذیب کی شرح ہے، اور یہ حال شروع سے رہا، چنانچہ اجمیر کے سفر کا ایک محرک یہ شوق بھی تھا دورہ سے فراغت کے بعد اسی ذوق نے حضرت کے شوق کو ابھارا اور حضرت اسی فکر و سعی میں لگے کہ ملک میں علوم عقلیہ کی کسی مستند و مرکزی شخصیت سے خصوصی طور پر مستفید ہوں، اس کیلئے حضرت نے اپنی معلومات اور وقت کی شہرت کے مطابق مختلف جگہوں کا قصد کیا، اور فراغت کے بعد تقریباً دو سال کا عرصہ علوم عقلیہ کی انتہائی و معیاری کتب کے درس میں لگایا۔

سب سے پہلے الہ آباد تشریف لے گئے، وہاں مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا قیام تھا، ان علوم میں ان کی امامت و فنین کا چرچا تھا، اور وہ مولانا عبدالماجد صاحب جونپوری کے شاگرد تھے، انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ اب میں ان علوم کی تدریس سے توبہ کر چکا ہوں، بہت کہا مگر تیار نہ ہوئے، اور مولانا عبدالقادر صاحب لکھنوی کا مشورہ دیا۔

اس کے بعد حضرت نے فرنگی محل کے مشہور عالم مولانا عبدالقادر صاحب کا قصد کیا، داخلہ بھی ہو گیا، مگر حضرت نے وہاں قیام و تعلیم کا ارادہ ترک فرمادیا محض اس وجہ سے کہ وہاں جو طلبہ اور رفقاء نظر آئے، وضع قطع میں ان کا مشرب ہی کچھ اور تھا، آزادروی اور اس زمانہ کی زبان میں فرنگیت پسندی، اس سے حضرت کو ایک اضطراب ہوا کہ ان کے ساتھ اپنا گذر کیسے ہو سکے گا۔

مظفر پور اب حضرت نے بہار کے ایک معروف منطقی عالم مولانا جمیل احمد صاحب کو اپنی منزل بنایا، ان کا قیام بہار کے مشہور شہر مظفر پور میں تھا، وہاں کے قدیم ادارہ جامع العلوم کے وہ مدرس تھے، وہ بھی مولانا عبدالماجد صاحب جونپوری کے شاگرد تھے، ان کا مشورہ مولانا یونس صاحب سیتامڑھی نے دیا تھا، پانی پت کے حضرت کے استاذ خاص مولانا عبدالرحیم صاحب بھی مولانا عبدالماجد صاحب جونپوری کے شاگرد تھے، چنانچہ انکی خدمت میں پہونچے، اور وہاں اپنے ذوق کے مطابق ماحول پایا تو تعلیم میں لگ گئے اور ارادہ یہ تھا کہ تکمیل تک قیام فرمائیں گے، مگر غذا و آب و ہوا کی وجہ سے صحت اس قدر متاثر ہوئی کہ اپنی خواہش اور استاذ کی فرمائش کے باوجود مظفر پور چھوڑنے پر مجبور ہوگئے، حضرت وہاں جب پہونچے تھے تو مولانا جمیل احمد صاحب بہت مسرور ہوئے تھے کہ میں تو ایسے آدمی کی تلاش میں تھا، یہ یوپی کی ہی امانت تھی تمہارے سپرد کردوں۔

دہلی و مرادآباد اس کے بعد دو حضرات سامنے تھے، ایک علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ دارالعلوم دیوبند کے مشہور فرزند اور علوم عقلیہ کے مسلّم امام جو ان دنوں مدرسہ عالیہ فتحپوری میں صدر مدرس تھے، اور دوسرے مولانا عجب نور صاحب (کوہاٹ نو۔افغانستان) جن کا قیام مرادآباد کے مدرسہ شاہی میں تھا، حضرت نے مرادآباد کے قیام کے زمانہ میں انکو دیکھا تھا، بلکہ یقیناً کچھ پڑھا بھی ہوگا۔

دہلی پہلے تو حضرت نے دہلی کا رخ کیا، اور حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری دی، مگر چند ماہ رہ کر پھر مرادآباد کا سفر فرمایا، اور وہیں تکمیل فرمائی، اور مروجہ جملہ کتب معقولات پڑھیں، وہیں سے تدریس کا نظام

بنا کر واپسی فرمائی، دہلی میں اصل مقصد مشغولیت حضرت علامہ کے پاس معقولات کی تعلیم تھی اور حضرت کے بیان کے مطابق حضرت تنہا طالب علم تھے خارج میں پڑھا کرتے تھے اس کے علاوہ علامہؒ کے دیگر اسباق بخاری وغیرہ کے جو تھے ان میں شرکت ہوئی حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ ایک کالج میں تھے، ان کے شمس بازغہ وغیرہ کے اسباق میں شرکت ہوئی، اور مولانا اشتیاق صاحب مظفر پوری بھی مدرسہ عالیہ فتحپوری میں استاذ تھے تو ان کے اسباق میں بھی شرکت فرمائی۔

مرادآباد مرادآباد میں مولانا عجب نور صاحبؒ حضرت کیلئے مرکز توجہ تھے، وہ وقت کے بڑے فاضلوں میں سے تھے، حضرت نے خود انکے تذکرہ میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ قاضی حمد اللہ، شمس بازغہ، میر زاہد، امور عامہ، تصریح، شرح چغمینی وغیرہ جیسی کتابیں حفظ پڑھاتے تھے، اور ایک مرتبہ انھوں نے ایک طالب علم کی بات پر فرمایا تھا، میر زاہد نے اگر ایسی کتاب لکھ دی ہے تو کوئی کمال نہیں، ان کو ہر طرح کا اطمینان حاصل تھا، اگر اس قسم کا اطمینان آج حاصل ہو تو اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ اس جیسی بہت سی کتابیں لکھ سکتے ہیں، اور حضرت باندوی فرماتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ ان میں یہ اہلیت موجود تھی، حضرت نے فرمایا کہ جب میں مرادآباد میں انکے پاس تھا تو ایک مرتبہ حضرت علامہ مرادآباد تشریف لائے، ملاقات ہوئی، پہچانا تو فرمایا کہ، مولوی صاحب کہاں ہو؟ میں نے عرض کیا! یہاں مولانا عجب نور صاحب سے پڑھ رہا ہوں، اس پر فرمایا کہ واقعی وہ عجب آدمی ہیں، یہ گویا علامہ جیسے فاضل کا ان کے لئے خراجِ عقیدت تھا۔

حضرت یہ بھی فرماتے ہیں کہ یوں تو معقولات کی تعلیم دیوبند، سہارنپور وغیرہ سب جگہ تھی مگر اچھی تعلیم اور طلباء کی تعداد مرادآباد ہی میں تھی طلباء پنجاب و سرحد وغیرہ کے تھے، یوپی کا میں تنِ تنہا تھا، بہر حال حضرت کی تعلیمی زندگی اور طلبِ علم

کے مراحل کی آخری منزل مراد آباد مدرسہ قاسمی اور مولانا عجیب نور صاحب علیہ الرحمہ قرار پائے، اس کے بعد تدریسی زندگی کا آغاز فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ذکاوت و ذہانت میں امتیاز کے ساتھ شغف و انہماک بھی خوب عطا فرمایا تھا اس لئے نتائج میں امتیازی نمبرات حاصل ہوتے تھے اور اس کی وجہ سے بعض تیز طلباء و رفقاء کی طرف سے مسائل بھی پیدا ہوجاتے تھے، مگر حق تعالیٰ نے حضرتؒ کے اخلاص کی برکت سے حفاظت فرمائی، اور جن اعلیٰ مراتب و مقامات تک پہونچا یا ان سے سب ہی واقف ہیں، خود فرماتے کہ ہم لوگ کتاب اس قدر دیکھتے کہ مختصر و ہدایہ کے صفحات اب بھی یاد ہیں اصول الشاشی کا مذاکرہ امتحان کیلئے ۲۱ مرتبہ اور مقامات کا ۲۳ مرتبہ کیا ہے[1]

---

[1] مضمون کے اکثر و بیشتر مندرجات خود حضرت سے سنے ہوئے ہیں احقر نے بھی سنا ہے اور دوسرے حضرات نے بھی، احقر نے مختلف اوقات میں حضرت کی باتیں سن کر جو ترتیب لکھی ہے، اور جو واضح ہوئی وہ یہی ہے جس کو احقر نے اختیار کیا ہے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

حضرت مولانا باندوی کی تدریسی زندگی اور درسی خصوصیات

از : مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی
استاذ حدیث جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی علیہ الرحمۃ کو درس و تدریس سے بڑا لگاؤ اور بڑی ہی دلچسپی تھی — بلکہ حق یہ ہے کہ درس و تدریس ہی انکی زندگی تھی، اور حضرت اس کو فرماتے بھی تھے کہ جبتک یہ سلسلہ ہے تب ہی تک زندگی ہے، بالخصوص جب انکے مشاغل اور اعذار کو دیکھکر سبق کی تخفیف کیلئے کہا جاتا، تو حضرت یہ بات فرماتے تھے، یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے ان علماء پر تعجب ہوتا ہے، اور مدارس کے ذمہ داروں پر بھی جو درس و تدریس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، اس لئے حضرت تعلیم کے زمانے میں شاید ہی کبھی سبق کا ناغہ کرتے ہوں، انتہائی مشغولیت ہی نہیں، شدید بیماری و تکلیف کے حال میں بھی، جبکہ سر اٹھانا اور کچھ بولنا انتہائی تعب و مشقت کا باعث ہوتا تھا، اس حال میں بھی حضرت کسی نہ کسی طرح سبق پڑھا ہی دیتے تھے، گھر پر بلا کر یا کمرے میں، خدام کی طرف سے

اگر کچھ زیادہ اور باصرار گذارش ہوتی کہ سبق نہ پڑھایا جائے، تو تدبیر سے طلبہ کو بلاتے،

اسباق تعداد میں عام مدرسین سے زیادہ ہی ہوتے، اور اہم بھی، ان آخری سالوں میں بخاری شریف جلد اوّل، جلالین ایک جزء، مختصر المعانی، اور منطق کی متعدد کتب حضرت سے متعلق تھیں، یہ تعداد وقتاً فوقتاً مزید بھی ہو جاتی تھی، بالخصوص ابتداءً تو بیس بیس اسباق روزآنہ پڑھائے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، ہر کتاب اپنے حق کے مطابق، اور نصاب کی رو سے مکمل اور وقت پر ہوتی تھی، صرف حضرت کی اس فکر کی وجہ سے کہ ناغہ نہ ہو، اور یہ کہ طلبہ کا نقصان نہ ہو، ایک عرصہ تک فجر سے قبل ایک دو نہیں بلکہ کئی اسباق ہوتے رہتے، صبح سے شام تک سلسلہ جاری رہتا تھا اور اب جبکہ اسفار کی کثرت ہو گئی تھی، اور دوسرے بھی مشاغل تھے، ان میں بھی اپنی راحت و آرام سے بڑھکر اسباق کی فکر رہا کرتی تھی، اسباق سے فارغ ہوکر سفر میں جانا، اور آتے ہی سب سے پہلے سبق پڑھانا، اور اسکی فکر کہ آج کے سب اسباق ہو جائیں، اس کیلئے حضرت قبل فجر، اور بعد عشاء نیز عصر بعد و مغرب بعد بھی سبق پڑھا دیا کرتے تھے، یوں تو ان سے متعلق اسباق کے بھی گھنٹے اور اوقات متعین تھے، قیام کے زمانے میں حضرت ان اوقات کا ہی اہتمام اور انکی پابندی فرماتے تھے، لیکن سفر کیوجہ سے تقدیم و تاخیر میں سبق کسی بھی وقت ہو سکتا تھا، حتی کہ عین دوپہر میں بھی جو کہ چھٹی اور طعام و آرام کا وقت ہوتا، لمبے سے لمبے سفر سے واپسی کے بعد براہ راست درسگاہ اور سبق میں بیٹھ جاتے کا معمول تھا، کھانا پانی سب بعد میں ہوتا جبتک کہ دو ایک سبق پڑھا نہ لیتے انھیں چین نہیں ملتا تھا۔

اس کا اتنا اہتمام تھا کہ وہ یہ پسند فرماتے تھے کہ میں اپنے کمرے تک جب

پہونچوں تو طلبہ درسگاہ میں پہونچ چکے ہوں، یا میرے پاس پہونچ جائیں، وہ مدرسے کے احاطے میں داخل ہونے سے قبل، اور داخل ہوتے ہی آدمی دوڑا دیتے کہ سبق کا اعلان کرو، یا کرادو، جب سے لاؤڈ اسپیکر ہوگیا تو اس سے اعلان ہوتا تھا، اور ادھر اس اعلان سے حضرت کی آمد کا سب کو علم ہوجایا کرتا تھا، حضرت کے اس شغف اور اہتمام واعلان کی یہ برکت یا ثمرہ۔ جو کچھ کہئے یہ تھا کہ مدرسے کے چھوٹے چھوٹے بچے، اور گھروں کی عورتیں بلکہ گاؤں کے اور مدرسے میں کام کرنیوالے غیر مسلم بھی حضرت سے متعلق اہم کتابوں کا نام جانتے تھے، بخاری شریف، جلالین، شرح جامی وغیرہ بلکہ بسا اوقات چھوٹے بچے یونہی کسی کتاب کا اعلان کرتے سنے جاتے تھے۔

ناغہ اور سبق کے نقصان سے بچنے کی جو فکر تھی اسکی وجہ سے اپنے اسباق کے علاوہ دوسرے اساتذہ کے اسباق برابر پڑھایا کرتے تھے، اور اگر دوسرے اساتذہ کے اسباق کا عارضی نظام بن رہا ہو تو خود زیادہ سے زیادہ حصہ لیتے تھے، بغیر کسی امتیاز وخیال کے ہر درجہ وہر فن کا سبق پڑھاتے، ابتدائی داول سے لیکر اخیر تک، اور ایک زمانے تک قرآن مجید، ناظرہ وقاعدہ وغیرہ بھی پڑھایا اور حفظ پر تو خصوصی توجہ تھی، مشاغل کے پڑھنے کے بعد بھی بچا ہوا وقت حفظ میں صرف فرماتے تھے۔

اتنے اہم اسباق، اور اسفار کی کثرت، دیگر مشاغل اور بسا اوقات اسباق کی بھی کثرت ہوتی تھی، پھر بھی حسب موقع وقت وکتاب کی رعایت کیساتھ مطالعہ کا پورا اہتمام تھا، اور مطالعہ کے بعد ہی اسباق پڑھاتے، اِدھر اسفار کی کثرت ہوجانے کے بعد اہم کتابوں کیلئے سفر میں بھی تیاری فرمالیا کرتے تھے، بالخصوص اگر علاقہ کا کوئی سفر ہوتا، تو مطالعہ کی کتاب ساتھ لے جاتے، اور واپس آکر سبق پڑھاتے، یہ بھی دیکھا گیا کہ خود مطالعہ فرمارہے ہیں، اور ایک آدمی منہ میں لقمے

دے رہا ہے، اس طرح کھانے کیساتھ ساتھ مطالعہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا، دوران مطالعہ یا دوران سبق اگر کوئی الجھن پیش آتی تو کتابوں سے مراجعت کے علاوہ ازراہِ تواضع اور بغرض تربیت خدام کو بلاتے، اور ان سے استفسار فرماتے کہ اس کا کیا مطلب ہے، بارہا اس کا سابقہ ہوا، طلبہ بیٹھے ہیں اور بلالیا، اور ان کے سامنے ہی دریافت فرمایا اور اس کی فکر و دھن تو رہتی ہی تھی کہ کس طرح کتابوں کے علوم طلبہ کے سینوں میں اتر جائیں، اور سبق انکے ذہن نشین ہو جائے، اور پھر یہ کہ طلبہ جلد از جلد اس مرحلے سے فارغ ہو کر دین کے کام میں لگ جائیں، اسلئے کہ ایک عالم و حافظ کیلئے حضرت کے نزدیک محبوب ترین مشغلہ یہی تھا، ایک مرتبہ ایک صاحب نے حضرت کے سامنے قطب وغیرہ کی کوئی بات کہی تو حضرت نے فرمایا: "مولانا — الف، ب پڑھانے والے کا جو مقام ہے، وہ کسی کا نہیں"

جو فن حضرت کی خاص دلچسپی کے تھے انکے اسباق تو عقدہ کشا اور بصیرت افروز ہوتے ہی تھے، دوسرے علوم و فنون کے اسباق بھی اہل علم حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتے، اور افادہ سے خالی نہیں ہوتے تھے، خاص فنون میں علوم آلیہ رہے، منطق کے اسباق بے تکلف پڑھاتے، اور درس نظامی میں فن نحو کی آخری کتاب شرح جامی اور بلاغت کی معرکۃ الآراء کتاب مختصر المعانی کا درس تو ساری زندگی حضرت سے متعلق رہا، اور حضرت ان دونوں کتابوں کی مشکلات کو پانی کر کے طلبہ کو سیراب کرتے رہے۔

حضرت کا سبق پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ طلبہ سے پہلے عبارت پڑھواتے درمیان میں نحوی و صرفی اشکالات کرتے، اعرابی حالت کی وجہ بھی دریافت کرتے، طلباء کے نہ بتانے پر خود ہی بتلاتے۔

ادھر شرح جامی وغیرہ میں یہ کرتے کہ شب میں بعد عشاء سونے سے قبل

طلباء سے عبارت سنتے اور یوں انکی تیاری کراتے، اور نحوی وصرفی مسائل کو زیر بحث لاتے۔

عبارت سے فارغ ہونیکے بعد مطلب بیان فرماتے، پھر طلبہ سے ہی ترجمہ کراتے ایک زمانے تک اس کا اہتمام رہا کہ اہم کتابوں میں سبق کے بعد سوالات لکھاتے تاکہ کتاب کی روشنی میں طلبہ ان سوالات کا جواب یاد کرلیں، حضرت کتاب وسبق کے یاد کرنے میں اسکو مؤثر ومفید گردانتے تھے، اور ہوتا بھی یہی کہ طلبہ کو عبارت اور سوال وجواب سب مستحضر ہوجاتا، متعدد کتابوں سے متعلق اسطرح کے سوالات کے مجموعے بھی حضرت نے تیار کئے تھے جن میں سے بالخصوص شرح جامی کے سوالات سے بہت فائدہ اٹھایا گیا۔

روزانہ گذشتہ دن کے سبق کا مختصر سا مذاکرہ بھی کراتے، اور اسکی بابت سوال وجواب کرتے کراتے، نحو وصرف کے قواعد کا کافی اجراء کراتے، کتاب کے علاوہ دوسری مثالیں بھی دیتے،

جامعہ کے بعض مؤقر اساتذہ اور ابتدائی عہد کے تلامذہ کا بیان ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہم نے حضرت علیہ الرحمہ سے میزان، صرف میر و پنج گنج۔ اور ۱۹۴۸ء میں علم الصیغہ ترجمہ پارہ عم والم پڑھا تھا بحمد اللہ خوب سمجھاتا تھا، کئی کئی کاپیاں نحو اکر لکھاتے تھے۔ ہدایہ کے دلائل بہت ہی اچھے انداز سے، اور بسا اوقات منطقی انداز و ترتیب سے صغریٰ وکبریٰ کی بنیاد پر سمجھایا کرتے تھے۔

اسباق میں کبھی کبھی مناسبت پر، خوف خدا، محبت الٰہی کے واقعات اور صلحاء کے قصے بھی سناتے، اور یہ تاثر پیدا کرتے کہ ہم بھی ایسے بنیں، کبھی کبھی خود اپنے حالات کا اور اساتذہ وغیرہ کا تذکرہ بھی فرمایا کرتے تھے، تقریر اور بلا وجہ تفصیل وتطویل کا مزاج نہیں تھا۔

طلبہ کی تنبیہ کا ہمیشہ اہتمام رہا۔ البتہ شروع میں تو یہ تھا کہ سبق میں طلبہ کی شرارت یا غفلت پر بانس کی قمچی سے پیٹھ پر دو مرتبہ اس طرح مارتے کہ چوٹ نہیں لگتی تھی البتہ طلبہ کو خفت اور شرمندگی ہوتی تھی لیکن تھوڑی دیر کے بعد بلا کر چار آنے پیسے دیا کرتے تھے۔

البتہ بعد میں طلبہ کو مارنے سے گریز کرتے، اور دوسروں کو بھی منع فرماتے تھے۔ اور فرماتے کہ طلبہ پر خوب محنت کیجائے مختلف طریقے اختیار کئے جائیں، ان کے حق میں دعائیں کی جائیں۔

اور امتحان میں نمبرات کے دینے میں تو تسامح سے کام لیا کرتے تھے، مگر سوالات میں دقت وہمہ گیری اختیار کرتے تھے، اسی لئے بالخصوص منتہی کتابوں کے سوالات بہت جامع اور حاوی ہوتے تھے، بسا اوقات ایک سوال کے تحت بڑی مفصل بحثوں اور کئی ابواب وفصول کو سمیٹ لیا کرتے تھے، جس کا مقصود یہ تھا کہ کتاب اور اس کے مندرجات پر طلبہ کی گرفت اور انکی محنت کا اندازہ لگایا جا سکے۔

حضرت کی تدریسی زندگی کے کل تین دور ہیں، پہلا: بہت مختصر بشکل دو سال مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں تدریس کا، دوسرا: ۱۹۳۶ء تا ۱۹۵۰ء تک مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں تدریس کا، تیسرا اور آخری دور باندہ میں کام اور جامعہ عربیہ ہتھورا میں تدریس کا رہا جامعہ کے آغاز بلکہ آغاز سے پہلے کی جد وجہد اور سعی وکاوش سے لیکر جامعہ کو تدریس کے آخری مراحل یعنی دورۂ حدیث شریف تک پہونچانے کا کام حضرت ہی نے انجام دیا، جامعہ کی بنیاد ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں پڑی، اور حضرت کی وفات ۲۲ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۷ء کو ہوئی، یہ تقریباً ۴۵ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔

اوّلین ملاقات اور پھر مولانا کے یہاں حاضری

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کا تذکرہ تو طالبعلمی کے ابتدائی زمانہ ہی میں کانوں میں پڑ گیا تھا، میری طالبعلمی کا دوسرا یا تیسرا سال تھا اب مجھے مزید پڑھنے کیلئے اپنے وطن سنبھل سے باہر کہیں جانا تھا، عم محترم حضرت مولانا نعمانی نے دو مدرسوں کے نام تجویز فرمائے تھے، ایک بہرائچ کا مدرسہ نور العلوم اور دوسرا حضرت مولانا سید صدیق احمد کا مدرسہ جامعہ اسلامیہ ہتھورا، ضلع باندہ، بعض ترجیحات کی بناء پر فیصلہ نور العلوم جانے کا ہوا تھا۔ مدرسہ نور العلوم میں بھی مولانا کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا، ہم لوگوں کے امتحان کے سلّم العلوم اور مختصر المعانی کے پرچے مولانا نے ہی بنائے تھے، اور کاپیاں بھی وہیں جانچنے کیلئے بھیجی گئی تھیں بس اتنی ہی واقفیت مولانا اور انکے مدرسہ کی تھی، عم محترم حضرت مولانا النعمانی کی زبان سے کبھی کبھی مولانا کے تقوے، للّٰہیت اور سادگی کا ذکر بھی سنا تھا، نور العلوم سے مختصر المعانی، شرح وقایہ وغیرہ پڑھ کر میں دار العلوم دیوبند چلا گیا، وہاں

تین سال پڑھنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں درجہ تخصص فی الادب کے دو سالہ نصاب میں داخلہ لے لیا، ندوہ میں میری تعلیم کا دوسرا سال تھا، امتحان میں ابھی چند مہینے باقی تھے، ندوہ کی مسجد میں ایک تبلیغی اجتماع تھا، اس میں شرکت کیلئے حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ تشریف لائے تھے، مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے کچھ لوگ ایک صاحب سے ملاقات کر رہے تھے، کسی نے بتلایا کہ یہ باندے کے مولانا صدیق صاحب ہیں، تذکرہ پہلے ہی سن چکا تھا، کسی قدر حسن اعتقاد بھی عم محترم حضرت مولانا نعمانیؒ کے ذریعہ سنی ہوئی باتوں سے دل میں گھر کئے ہوئے تھا، ملاقات ہوئی، اور غالباً تعارف بھی، اسی دن تھوڑی دیر کے بعد میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مکتبہ میں اپنے محسن اور دوست حافظ سمیع اللہ صاحب سے ملاقات کیلئے گیا، وہ اس وقت مکتبہ کے ذمہ دار تھے، جیسے ہی میں نے مکتبہ میں قدم رکھا، دیکھا کہ حضرت مولانا وہاں تشریف فرما ہیں، میں نے سلام کیا، آپ نے جواب دیا اور فوراً ہی حافظ سمیع اللہ صاحب نے بلا کسی تمہید کے کہا حضرت انھیں لیجائیے، غالباً مولانا کو کسی مدرس کی تلاش تھی، حافظ جی نے تعارف بھی کرادیا۔

حضرت نے فرمایا ارے بھئی یہ بڑے آدمی ہیں، ہمارے مدرسہ میں کہاں جاسکتے ہیں، میری زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکلا حضرت آپ فرمائیں تو میں ابھی درمیان سال میں ہی تعلیم منقطع کر کے آپ کے ساتھ چلوں، فرمایا تعلیم مکمل کر لیجئے، اور آئندہ سال آجائیے گا، لیجئے میری قسمت کا ستارہ چمک گیا۔ اسے کہتے ہیں تقدیر خداوندی، آج ہی پہلی ملاقات ہوئی ہے، اور آج ہی اللہ نے مولانا سے وابستگی کا بھی فیصلہ کرادیا، تعلیمی سال کے اختتام پر جب میں لکھنؤ سے سنبھل جانے لگا تو عم محترم حضرت مولانا نعمانی نے آئندہ کے پروگرام کے متعلق دریافت کیا، میں نے حضرت سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا ذکر کردیا، عم مرحوم نے فرمایا، مولانا تو اپنے

ہی ہیں، انکو ہم بھی خط لکھ کر یاد دہانی کرا دیں گے، میں سنبھل چلا گیا، پندرہ بیس دن کے بعد عم محترم نور اللہ مرقدہ کا ایک خط سنبھل پہونچا، جس میں انھوں نے مولانا کے نام اپنے خط کا خلاصہ ۔ کہ مولوی زکریا سے آپ کی اس طرح کی گفتگو ہوئی تھی، اگر آپ کے یہاں واقعی ضرورت ہو تو وہ خدمت کیلئے حاضر ہیں ۔ لیکن انکے لئے جگہ نکالی نہ جائے ۔ مجھے لکھ کر بھیجا ۔ اور حضرت کا جواب بھی مجھے بھیج دیا ۔ حضرت کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ زکریا ہمارے مدرسہ میں پڑھانے کیلئے آئیں ۔ سر آنکھوں پر لیکن ہمارے مدرسے میں یہ یہ نقص ہیں، مدرسہ دیہات میں ہے، شہری سہولتیں بالکل نہیں ہیں، بجلی نہیں ہے، نائی دھوبی بھی نہیں، چائے والے کی دوکان نہیں، راستہ مدرسہ تک کچا ہے، مکانات کھپریل کے ہیں، مطبخ کا نظام بہت خراب ہے، میرے گھر کے حالات بھی اس طرح کے نہیں ہیں کہ میں کھانے کا کچھ مناسب نظم کر سکوں مدرسین کی تنخواہ بھی پچاس ساٹھ روپے ہے، عم محترم نے اس خط کو دیکھنے کے بعد مجھے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ پہلے تو میری رائے تھی، لیکن مولانا کا خط پڑھ کر اب میرا خیال یہ ہے کہ تم خود فیصلہ کر و کہ تم ایسی جگہ رہ سکتے ہو یا نہیں ۔ ادھر میں نے مولانا کے خط کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ حضرت معذرت ہی فرمانا چاہتے ہیں، لیکن مجھے تدریس کی زندگی شروع کرنی تھی، اور میرے پاس پڑھانے کیلئے کوئی جگہ نہ تھی، اس لئے میں نے ایک سال کیلئے تو حضرت کے یہاں جانے ہی کا فیصلہ کر لیا، اور غالباً بذریعہ خط عم مرحوم و مغفور کو بھی اسکی اطلاع دیدی شوال کے آخر میں باندہ جانے کے ارادے سے ہی سنبھل سے لکھنؤ آیا، یہاں آکر ایک اور امتحان پیش آیا، حضرت مولانا نعمانی ؒ نے ایک اور مدرسہ کا بھی ذکر کیا، اور فرمایا، وہاں ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ ہوگا، لیکن رمضان میں مدرسہ کا کام بھی کرنا ہوگا ۔ ادھر مولانا کی نیکی اور تقوے کا بھی ذکر کیا، کہاں مولانا

کے یہاں کے ۵۰ / ۶۰ روپئے تنخواہ اور کہاں اس مدرسہ میں ڈھائی سو روپے۔
لیکن الحمد للہ فیصلہ مولانا کے مدرسہ میں جانے ہی کا ہوگیا، اور غالباً شوال کی ۲۶ یا ۲۷ تاریخ کو حضرت حافظ محمد اقبال صاحب گونڈوی کے ہمراہ باندہ چلا گیا، عم محترم نے حضرت حافظ صاحب کو میری رہنمائی کیلئے بھیجا تھا، مدرسہ جاکر اندازہ ہوا کہ حضرت نے جو کچھ اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا تھا اس میں ایک لفظ بھی خلاف واقعہ نہ تھا۔
روانگی کے وقت عم محترم مولانا نعمانی نے کچھ نصیحتیں فرمائی تھیں، جو زندگی بھر کیلئے بہت ہی مفید ثابت ہوئیں، حضرت نے فرمایا مولانا کے ہر کام میں ہاتھ بٹانا مالیات میں دخل نہ دینا، آدمی ابتداء میں خیانت کی نیت نہیں کرتا ہے، بعض اوقات مجبوراً انجام کار خیانت کرنی پڑ جاتی ہے، الحمد للہ میں نے اس نصیحت سے بہت فائدہ اٹھایا، دوسری بات حضرت مولانا نعمانی صاحب نے یہ کہی تھی کہ مولانا اگر کتابوں کے بارے میں تم سے دریافت فرمائیں کہ تم کیا پڑھانا چاہتے ہو، تو میرے حوالہ سے تم یہ عرض کر دینا کہ مدرسہ کی مصلحت اور ضرورت جو بھی ہو میں اسی کے مطابق کتابیں پڑھانے کیلئے تیار ہوں، لیکن جب آپ دریافت فرماتے ہیں تو میری خواہش یہ ہے کہ ہر فن کی ابتدائی کتابیں مجھے عنایت فرمادیں، اور ایک کتاب اوپر کی ہدایہ یا شرح وقایہ دیدیں تاکہ نیچے سے بھی استعداد پختہ ہوتی رہے اور اوپر کی کتابوں سے بھی تعلق برقرار رہے۔
مدرسہ حاضر ہونیکے بعد تین دن تک مولانا نے مہمان محض بنائے رکھا، میرے عرض کرنے پر بھی فرمادیا کہ پڑھانا تو ہے ہی، ابھی دو تین دن ذرا آرام کرلیں، ان تین دنوں میں مولانا نے ہمہ وقت مجھے اپنے ساتھ رکھا، باندہ شہر تشریف لے جانا ہوا تو بھی ساتھ لے گئے اس پیکر شفقت ومحبت کو دیکھنے کا مجھے پہلا موقع نصیب ہوا تھا، جو شفقت ومحبت اسوقت ملی الحمد للہ تاحیات باقی رہی، کبھی ایک

لمحہ کو انقطاع نہیں ہوا۔

تین دن کے بعد مجھے کتابیں پڑھانے کیلئے دیدی گئیں، ہر فن کی ابتدائی کتابیں اور شرح وقایہ اوّلین و دوم میرے لئے منتخب فرمائیں، لیکن ابتدائی کتابیں بھی ایسی نہیں جو مدرسوں میں بے وقعت سمجھی جاتی ہیں، ابھی پہلے سال کے چند مہینے ہی گذرے تھے کہ مجھے تفسیر جلالین کا کچھ حصہ بھی پڑھانے کیلئے دیدیا، اور دوسرے سال تفسیر بیضاوی مجھ سے پڑھوادی، اس کے بعد تو درجہ بدرجہ کتابیں اونچی ہی کرتے گئے۔

میری مدرسی کا غالباً چوتھا یا پانچواں سال ہی تھا، اور میرے پاس تفسیر بیضاوی ہدایہ آخرین، تفسیر جلالین، مشکوٰۃ جلد ثانی، فصول اکبری، اور کچھ ہلکی پھلکی اور کتابیں بھی تھیں، کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں بھی میرے اوپر حضرت کی بہت ہی خاص عنایات تھیں، شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے یہاں زیادہ دن نہ رک سکوں گا اس لئے وہ اپنی سرپرستی میں مجھ سے سبھی کچھ پڑھوالینا چاہتے تھے، میں نے تو انکی خدمت ہی میں جاکر تدریس کی ابتدا کی تھی، اس لئے بسا اوقات مجھے انکی سرپرستی کی ضرورت پڑتی تھی، اور میں بلاتکلف ان سے پوچھتا اور رہنمائی حاصل کرتا تھا، میں جب بھی کسی کتاب کی عبارت حل کرنے جاتا تو حضرت بتلادیتے اور میرے جانے کے بعد وہاں موجود طلباء سے کہتے کہ اس طرح پڑھایا جاتا ہے، پھر اسی پر اکتفاء نہ کرتے، بلکہ اس خیال سے کہ طلباء میرے بارے میں کوئی غلط تأثر قائم نہ کرلیں، بعد میں بھی حضرت مجھے یاد فرماتے، اور کسی بھی کتاب کی عبارت کا مطلب طلبہ کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے، کبھی میں کچھ عرض کردیتا تو غیر معمولی مسرت کا اظہار فرماتے، اور کبھی میں بتلانے سے قاصر ہوتا تو خود مطلب بیان فرماتے، اور مجھ سے توثیق کراتے، اور یہ بھی فرماتے یہ مطلب آپکی برکت سے

سے سمجھ میں آیا ہے، میرے خیال میں یہ سب میری عزت افزائی اور طلبہ کے ذہنوں کو میری طرف سے صاف رکھنے اور کسی غلط تاثر کے قائم ہونے دینے کے لئے تھا میں نے کسی ذمہ دار مدرسہ کے ایسے حالات نہ دیکھے نہ سنے تھے، حضرت کی عزت افزائی کا ایک واقعہ انہیں کے الفاظ میں اور لکھتا ہوں، ویسے اپا زاپنی حقیقت سے واقف ہے، کبھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا۔

میں حضرت کے کمرے کے سامنے برآمدہ میں شرح وقایہ پڑھا رہا تھا کہ اچانک حضرت تیزی کیساتھ کمرہ سے باہر تشریف لائے اور سب طلبہ کے سامنے میرے پڑھانے کی تعریف فرمانے لگے اور فرمایا کہ میں سوچ رہا تھا کہ اس مشکل جگہ کو آپ کیسے حل کریں گے، واللہ کیا تعبیر آپ نے کی ہے۔ مولانا اسے قلمبند کر دیجئے، مولانا میرے کام آئے گا، اور یہ جملہ بار بار دہراتے رہے۔ میں اب بھی جب یہ باتیں لکھ رہا ہوں آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس مرد خدا کے احسانات کا نہ بدلہ ادا کر سکا ہوں نہ کر سکوں گا۔ ہاں الحمد للہ محبت وعقیدت ہمیشہ رہی، اور دعا کی توفیق بھی ملتی رہی، خدا کرے ہمیشہ یہ توفیق باقی رہے، مجھ حقیر کیساتھ انکے لطف وکرم کے ایسے واقعات بہت ہیں، اپنے اساتذہ کے بعد پڑھنے پڑھانے کی زندگی کی تعمیر میں حضرت کے اس طرح کے احسانات کا بڑا دخل رہا ہے۔ حضرت کے لطف وکرم سب ہی اساتذہ کیساتھ یکساں تھے، لیکن اخفاء کا یہ حال تھا کہ کسی کو دوسرے کے ساتھ ہونیوالے احسانات کا علم کم ہی ہوتا تھا۔ اس لئے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ حضرت مجھ سے سب سے زیادہ محبت فرماتے ہیں۔ مدرسہ کے اساتذہ سب ہی ہر اعتبار سے مولانا سے بہت چھوٹے تھے لیکن مولانا سب کو اپنا محترم اور مخدوم بنا کر رکھتے تھے۔ اگر کبھی کسی استاذ نے تنخواہ لینے کیلئے حضرت کے پاس جانے میں تاخیر کر دی تو حضرت اسکی قیامگاہ پر تشریف لا کر تنخواہ عنایت فرماتے تھے۔

باندہ تشریف لے جاتے تو اساتذہ سے دریافت فرماتے میں باندہ جا رہا ہوں کوئی کام تو نہیں ہے، اور یہ سوال اتنا مبنی بر حقیقت ہوتا تھا کہ بعض اساتذہ بتلا بھی دیتے تھے کہ یہ کام ہے اور حضرت وہ کام کرتے بھی تھے، میرے ساتھ تو یہ بھی لطف وکرم بارہا ہوا کہ باندہ سے کوئی چیز لائے، اور کمرہ پر آ کر بہت آہستہ سے آواز دی، اور فرمایا میں باندہ گیا تھا، یہ چیز آپ کیلئے لے آیا ہوں، ان چیزوں میں کبھی موسم کا کوئی پھل ہوتا، کبھی مٹھائی ہوتی، یہ معاملہ جیسا کہ ابھی عرض کیا اور اساتذہ کیساتھ بھی ہوتا ہوگا، مگر مجھے تو اپنے ساتھ ہونیوالے لطف وکرم کا علم ہوتا تھا۔

مولانا کی ابتدائی طالب علمی

اپنی ابتدائی طالب علمی کا یہ واقعہ بھی حضرت نے بارہا سنایا کہ میرے استاذ جو گاؤں کی مسجد میں مجھے حفظ کراتے تھے صرف ۷ یا ۸ پارے کے حافظ تھے، جب میں نے اتنے پارے حفظ کر لئے تو فرمایا: بیٹا! اب تم کہیں باہر چلے جاؤ، ہم تو صرف اتنا ہی پڑھا سکتے تھے، حضرت کے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، والدہ مرحومہ نے کچھ کر کرا کے تھوڑا بہت انتظام کانپور جانے کا کر دیا، حضرت کیساتھ کچھ خشک روٹیاں اور غالباً تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے بھی کر دئے، کانپور کے کسی مدرسے میں جا کر داخلہ لے لیا، مدرسہ سے کھانے کا انتظام ہوا نہیں یا حضرت نے لینا پسند نہیں کیا، یہ تفصیل مجھے یاد نہیں رہی، بہر حال کھانا مدرسہ سے نہیں ملتا تھا، کچھ دن تو ساتھ لائے ہوئے سامان پر گذارا کیا، جب وہ ختم ہو گیا تو اللہ نے ایک وقت کھانے کا انتظام اس طرح کرا دیا کہ کانپور کے استاد صاحب نے فرمایا: صدیق تم ہمارے گھر سرکاری نل سے پانی بھر دیا کرو اور ایک وقت کا کھانا ہمارے یہاں سے لے لیا کرو، انکا گھر بالائی منزل پر تھا، دو دو بالٹی لیکر زینہ پر چڑھنا پڑتا تھا فرماتے تھے بیچ زینہ میں کھڑے ہو کر رو لیا کرتا تھا، لیکن اسکے سوا چارہ ہی

کیا تھا، چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کھانا ملتا تھا، لیکن حضرت مولانا صدیق احمد صاحب بننے کیلئے ابھی اور سخت تربیت اللہ کو منظور تھی، حضرت نے بارہا سنایا کہ ایک مہینہ بھی اس ایک وقت کے کھانے کے انتظام کو نہ ہوا تھا کہ ہمارے گاؤں کے ایک ساتھی حافظ نعمت اللہ میرے ساتھ پڑھنے کے لئے کانپور آگئے، اب صورت یہ تھی کہ ایک وقت کا کھانا اور دو آدمی، کچھ دنوں کے بعد ایک ساتھی اور آگئے، اور اب ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک ایک چپاتی ہی حصہ میں آتی تھی، یہ نئے آنیوالے ساتھی تو اس آزمائش کو برداشت نہیں کرسکے، اور جلد ہی وطن واپس چلے گئے، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ نعمت اللہ دونوں نے ایک سال پورا صرف ایک وقت کی ایک خوراک میں گذار دیا۔

مدرسہ کے قیام کا محرک ضلع باندہ اور اسکے قرب وجوار میں کوئی قابل ذکر دینی ادارہ نہ تھا، اور نہ کوئی شخصیت مدت سے دینی کام کرنیوالی رہی تھی، اس لئے اس علاقہ کا دینی حال بہت ہی خراب تھا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو صرف نام کے مسلمان تھے، حقیقت اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا، بلکہ بعض برادریاں تو اپنا تعارف اس طرح کراتی تھیں کہ ہم نہ تو ہندو ہیں نہ مسلمان، ہم تو فلاں برادری سے تعلق رکھتے ہیں، آزادی کے بعد باندہ ضلع میں شدھی تحریک والوں نے ایسے کمزور مسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کر دیا تھا، اور ارتداد کا ایک سیلاب سا آگیا تھا، سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مسلمان یا تو واقعی مرتد ہو گئے تھے یا بالکل ارتداد کے قریب پہونچ گئے تھے، حضرت اس زمانہ میں فتح پور کے مدرسہ اسلامیہ میں پڑھاتے تھے، وہاں باندہ اور اس کے اطراف کی یہ خبریں پہونچتی رہتی تھیں، خود سناتے تھے کہ ایک رات کو جب سونے کے ارادے سے لیٹا تو یہ خیال آگیا کہ کل قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال

نہیں فرمائیں گے کہ تم نے یہ کتابیں پڑھائی تھیں کہ نہیں، بلکہ مجھ سے یہ سوال ہوگا کہ تمہارے علاقے میں ارتداد پھیل رہا تھا، لوگ مرتد ہو رہے تھے تم نے کیا کیا؟ اس سوال کے ذہن میں آنے سے نیند غائب ہوگئی، ساری رات اسی فکر میں ذہن غلطاں و پیچاں رہا، اور ایک منٹ کو بھی نہ سو سکا، لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی دل و دماغ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب اپنے علاقے کے لوگوں میں کام کرنا ہے، اور ان کے ایمان کی فکر کرنی ہے، پھر اسی ارادہ سے اہل مدرسہ سے اجازت لیکر اپنے یہاں چلا آیا، شروع میں کام کی صورت یہ تھی کہ ایسے علاقوں کے دیہات میں جہاں ارتداد کی وبا عام ہو رہی تھی حضرت نے تن تنہا دورہ شروع کر دیا اور جہاں اور جیسے دین کی بات کرنیکا موقع ملتا بات کرتے، میں نے ابھی کچھ دنوں پہلے اس دورہ کی کچھ تفصیلات دریافت کی تھیں، تو فرمایا کہ جو لوگ میرے گاؤں ہتھورا سے واقف تھے، وہاں جاکر تو ہتھورا کے حوالے سے تعارف کرا کر بات کرتا، اور جو لوگ میری سسرال کے لوگوں سے واقف تھے ان سے ان لوگوں کے حوالہ سے بات شروع کرتا۔ اسی طرح ایک دن میں کئی کئی دیہات گھوم پھر کر دین کی بات ان لوگوں کو پہونچایا کرتا تھا، میرے سوال کے جواب میں یہ بھی فرمایا، رات کا قیام کبھی کسی کھلیان میں، کبھی کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر بھی کرنا پڑتا تھا، اسطرح کام کرتے ہوئے کئی مہینے گذر گئے تو محسوس ہوا کہ مدرسہ کی ضرورت ہے جسے اس کام کے مرکز کے طور پر استعمال کیا جائے، اور ان لوگوں کے بچوں کو وہاں پڑھانے کیلئے لے جایا جائے، مدرسہ کی تجویز مولانا نے باندہ اور اس کے قرب وجوار کے لوگوں کے پاس جا جا کر رکھی، بعض حضرات سے بڑی امیدیں وابستہ کرکے ان کے پاس گئے، لیکن اس کام کے نام سے ہی سب کانوں پر انگلیاں رکھ لیتے تھے، لوگوں نے یہ تک کہا صدیق! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں، اور تم مدرسہ

کی بات کرتے ہو، اس سلسلہ کی تفصیلات حضرت بہت بتلایا کرتے تھے، بہت سی ابھی تک میرے حافظہ میں محفوظ ہیں، مگر بات بہت طویل ہو جائے گی، ہر طرف سے مایوس ہو کر مولانا نے اپنے گاؤں میں مدرسہ کھول ہی دیا، گاؤں والے سب بیحد غریب، کچے کچے مکانات مسجد بھی بہت چھوٹی اور خستہ، مگر مولانا کے عزم مصمم کے سامنے کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہ رہی، ان ہی دنوں حضرت نے ایک طویل نظم کہی تھی جس کے کچھ اشعار حضرت نے مجھے کئی بار سنائے اور جب بھی سنائے آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں، خدا کرے وہ نظم کہیں محفوظ ہو، نظم کیا تھی ٹوٹے اور دکھی دل کی آہیں تھیں۔

مدرسہ کی تعمیر کے متعلق کچھ باتیں۔

حضرت کا مدرسہ اب تو ایک عظیم الشان قلعہ معلوم ہوتا ہے، میں جب حاضر ہوا تھا اسوقت بھی کافی عمارتیں بن چکی تھیں، لیکن موجودہ عمارتوں کا شاید دسواں حصہ ہی تھیں، اس وقت سے بھی کئی سال پہلے یعنی اب سے تقریباً ۲۵ سال پہلے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے مدرسہ دیکھ کر تحریر فرمایا تھا۔ اللہ اکبر! گاؤں کتنا چھوٹا، اور مدرسہ کتنا بڑا، اللہ کے دین کے قلعے کہاں کہاں اللہ کے بندوں نے تعمیر کر دئیے ہیں۔ بالکل جنگل میں منگل معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ عمارتیں کیسے بنیں ہیں، موجودہ دور میں اسکا تصور بھی مشکل ہے، میں نے سنا بھی اور خود دیکھا بھی کہ تعمیر مدرسہ کیلئے خود چھوٹا سا ایک بھٹہ لگایا جاتا تھا، اس میں ہر ہر مرحلہ پر خود حضرت اور اساتذہ و طلبہ کام کرتے تھے، پھر تعمیر کے کام میں حضرت کیساتھ اساتذہ و طلبہ بالکل مزدوروں کی طرح لگ جاتے تھے، مورنگ اور سیمنٹ کے مسالے سے ہاتھوں میں زخم ہو ہو جاتے تھے، یہ جو قلعہ نما عمارت بنی ہے، اس میں بلا مبالغہ حضرتؒ اور حضرتؒ کے مدرسہ کے کتنے ہی اساتذہ اور

طلبہ کا پسینہ ہی نہیں خون بھی شامل ہے، اللہ تعالیٰ ان محنتوں اور کاوشوں کا اپنی شان عالی کے مطابق سب ہی کو اجر عطا فرمائے۔

مدرسہ کے قریب ایک نالہ ہے، برسات میں اسکا پانی اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے کنکر بڑی مقدار میں بہالاتا ہے، وہ کنکر خاص خاص جگہوں پر نالے کے کنارے جمع ہوجاتے ہیں پتھر کی تعمیر میں چونے کیساتھ ملاکر یہ کنکر استعمال کیئے جاتے ہیں، حضرت اس بات سے بہت واقف تھے کہ نالے کے کس کس موڑ پر کنکر زیادہ ملتے ہیں پھر انکو جمع کرنا اور دھونا بھی بہت خوب جانتے تھے، طلبہ کو لیکر خود نالے پر تشریف لے جاتے، طلبہ کیساتھ کنکر جمع کرتے، انکو ٹوکریوں میں کرکے خود دھوتے اور بیل گاڑی پر لدواکر لاتے تھے، حضرت کیساتھ کام کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا سبھی لوگ حضرت سے بے تکلف تھے، بلکہ بعض طلبہ تو جو پرانے ہوچکے تھے حضرت سے چھیڑ چھاڑ بھی کرلیتے تھے، ایسا پیارا اور محبوب مربی نہ دیکھا، نہ سنا، لطیفے بھی ہوتے تھے، حضرت ہنستے ہنساتے بھی تھے، ایسی حسین ہنسی اور اتنے خوبصورت دانت کم ہی دیکھے ہونگے، تعمیر کے سلسلہ میں سب لوگوں سے مشورے بھی لئے جاتے اور مشوروں کو قبول بھی فرماتے تھے، اس طرح تنکا تنکا کرکے یہ آشیانہ تعمیر ہوا ہے اپنے مدرسہ کے علاوہ حضرت کو بستی بستی، قریہ قریہ مکاتب کے قیام کی بہت فکر رہتی تھی، ایسے مدرسے یا مکاتب جن کا پورا خرچ حضرت ہی ذمہ تھا، تقریباً سو تھے اللہ جانے کتنے ہی دیہات میں جہاں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونیکی وجہ سے مسجد نہ بن سکی تھی، حضرت نے وہاں کے ہندو بھائیوں کو اعتماد میں لیکر مسجدیں بنوادیں، جہاں مسجد کی گنجائش نظر نہ آئی، وہاں قبلہ رُخ ایک کمرہ درسگاہ کے نام پر بنوادیا، اور اسی میں تعلیم اور نماز کا نظم فرمادیا کرتے تھے، حضرت کہا کرتے تھے کہ جس گاؤں میں مسجد ہے اس گاؤں کے مسلمانوں، اور جس گاؤں میں مسجد

نہیں ہے وہاں کے مسلمانوں میں دینی اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

تواضع وانکساری

مولانا تواضع وانکساری کے پیکر تھے، اپنی ذات کو سب سے کمتر، اور اپنے کو سب کا ادنیٰ خادم سمجھتے تھے خدمت کے واقعات بہت سے پڑھے ہونگے یہ بھی پڑھ لیجئے، مدرسہ میں مسجد کے سامنے بارہ عدد بیت الخلاء بنے ہوئے تھے، جو طلبہ، اساتذہ سبھی کے استعمال میں رہتے تھے، باندہ کے دیہاتی طلبہ جس جس طرح انکو گندہ کر سکتے تھے، کرتے تھے، لیکن صبح کے وقت سب بیت الخلاء روزانہ بالکل دھلے ہوئے ہوتے تھے کسی کو دھونے والے کا پتہ نہ چلتا تھا، ایک رات تقریباً ڈھائی بجے مجھے بیت الخلاء جانیکی ضرورت محسوس ہوئی، جب میں کسی قدر قریب پہونچا تو دیکھا کہ کوئی صاحب مسجد کے وضوخانے کا پانی جس گڑھے میں جمع ہوتا تھا اس سے بالٹی میں پانی لیکر بیت الخلاء دھو رہے ہیں، غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے حضرت ہی ہیں، کہاں کا تقاضہ، خاموشی سے واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا، اور حضرت کو یہ کرتے ہوئے دیکھتا رہا آگے بڑھ کر حضرت کیساتھ شریک ہونیکی ہمت نہ ہوئی تھی، کہ حضرت کو راز کے فاش ہوجانے پر افسوس ہوگا۔ اور حضرت کو یہ سب کرتا دیکھ کر نیند کا کیا سوال۔ اس کام سے فارغ ہوکر مسجد کے قریب کنویں پر جو نل لگا تھا، وہاں جاکر غسل فرمایا، اور مسجد کے صحن میں تہجد کی نماز شروع کردی اللہ ہی جان سکتا ہے کہ اس کے یہاں ان کاموں کا کیا اجر ملے گا، اور اس تہجد کی نماز پر اسکو کتنا پیار آتا ہوگا۔ اپنے کمرے کے سامنے صحن اور برآمدہ میں جھاڑو دے لینا تو کوئی بات ہی نہ تھی، یہ تو روزمرہ کا کام تھا۔

بہت ہی معزز مہمانوں کیلئے حضرت کے کمرہ کے قریب دو بیت الخلاء بنے ہوئے تھے، ایک بار مدرسہ میں ایک بہت محترم بزرگ آنیوالے تھے کہ اس

بیت الخلاء کا ٹینک بھر گیا، مولوی محمد منظور اور مولوی انیس احمد کو جو حضرت کے قریبی لوگوں میں ہیں بلایا، اور فرمایا ایک کام ہے، ہم ہی لوگ کر سکتے ہیں، بتلاؤ کرو گے؟ ان لوگوں نے عرض کیا ضرور، فرمایا یہ کام ہے، ان نوجوانوں کو بھی شاباش ہے کہ ان لوگوں نے حضرت کیساتھ یہ کام کیا، انہی دونوں کی روایت ہے، حضرت بھی بالٹیاں بھر بھر غلاظت وہاں سے لیجاکر دور کھیت میں ڈال کر آتے تھے۔

طلبہ کیساتھ حسن سلوک

طلبہ کیساتھ اپنی اولاد کی طرح معاملہ کرتے، ان کی ہر طرح کی فکر فرماتے، طلبہ کو کھانا تو مدرسہ سے ملتا ہی ہے، کسی غریب طالبعلم کے پاس کپڑے نہ ہوتے، تو اسکی فکر بھی فرماتے، دوا علاج کا بھی حتی الامکان اہتمام فرماتے تھے۔ مدرسہ کے ایک طالبعلم کے چیچک نکل آئی تھی، حضرت سفر میں تھے، تین چار دن کے بعد سفر سے آئے، آتے ہی مدرسہ اور اہل مدرسہ کی خیریت دریافت کی، جب اس طالب علم کی چیچک کا علم ہوا تو بہت بیچین ہوگئے، اور فوراً باندہ واپس جانیکا ارادہ فرمالیا، ہم لوگوں نے ہر چند عرض کیا کہ آپ ابھی طویل سفر سے تشریف لائے ہیں، سخت گرمی کا وقت ہے کسی کو بھی اپنا خط لیکر باندہ کے کسی ڈاکٹر کے پاس بھیجدیجئے، لیکن کسی طرح ہم لوگوں کی درخواست قبول نہیں فرمائی، اور سخت دھوپ میں باندہ تشریف لے گئے، اسوقت باندہ جانے کیلئے ڈیڑھ کلومیٹر پیدل چل کر بس سے جانا پڑتا تھا بسوں کا نظام بھی بہت اچھا نہ تھا۔ خصوصاً دوپہر میں تو بعض اوقات کافی انتظار کرنے پر بس ملتی تھی، اتنی دیر لو کے تھپیڑوں سے ہی واسطہ پڑتا تھا، حضرت مدرسہ سے تقریباً ۱۲ بجے روانہ ہوئے تھے، اور تین بجے باندہ کے کئی ڈاکٹروں کو لیکر جو سب ہی حضرت سے نیازمندی کا تعلق رکھتے تھے تشریف لائے

ڈاکٹروں نے اس طالب علم کو دیکھا اور حضرت کو اطمینان دلادیا، جبتک وہ طالبعلم بالکل صحت یاب نہ ہوگئے، تب تک حضرت انکی تیمار داری اور دوا علاج کی فکر خود فرماتے رہے، ایک بار ایک پرانے شاگرد کی کسی بات پر ذکر فرمانے لگے اس شخص کا میں نے پیشاب پاخانہ دھویا ہے، اور فرمایا یہ حقیقت ہے مبالغہ نہیں۔

ضلع باندہ اور اس کے قرب وجوار کے دیہات میں مسئلہ صرف علم اور دینداری کے نہ ہونیکا نہیں تھا، بلکہ اسلام کی بقاء اور عدم بقاء کا مسئلہ تھا، اور مولانا کے نزدیک یہ مسئلہ اتنا ہی اہم تھا جتنا ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے مولانا ان دیہات کے طلبہ کی بہت رعایت کرتے تھے، یہ طلبہ اگر مدرسہ میں پڑے رہیں خواہ پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں، تب بھی مولانا کو انکا قیام منظور تھا، میں اپنی کوتاہ نظری سے کبھی کبھی ایسے نہ پڑھنے والے طلبہ کے بارے میں حضرت سے کچھ نامناسب گفتگو بھی کرلیا کرتا تھا، ایک طالب علم لال محمد تھا، بالکل پڑھتا نہ تھا، کئی بار حضرت سے عرض کیا کہ اسکو اسکے گھر بھیج دیجئے، حضرت ٹال دیتے، ایک دن فرمانے لگے لوگ کہتے تھے لال محمد نہیں پڑھ پائے گا، دیکھئے اس کا قرآن مجید ناظرہ ختم ہوگیا، میں سمجھ گیا مخاطب میں ہی ہوں، میں نے عرض کیا اس نے پانچ سال میں صرف ناظرہ قرآن ختم کیا ہے، میرے نزدیک مدرسہ کی رقم کسی طالبعلم پر صرف ناظرہ کیلئے پانچ سال تک خرچ کرنا جائز نہیں، حضرت کا جملہ ہمیشہ یاد رہے گا، کسی قدر شان جلالی کیساتھ فرمایا، مولانا! اپنے گاؤں میں اسلام کو سمجھنے والا صرف لال محمد ہوگا، اس علاقے کے لڑکے یہاں پڑے رہیں خواہ ایک لفظ نہ پڑھیں تب بھی مجھے گوارا ہے، میں سچ عرض کرتا ہوں بالکل ایسا محسوس ہوا کہ میری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا، اس جملہ سے وہ سامنے سے ہٹ گیا، مجھے اپنی وہ کیفیت بھی ابھی تک یاد ہے، بہت دیر تک اپنی

کوتاہ بینی اور حضرت کی نگاہ کی دوربینی کو سوچتا رہا، اس اللہ کے بندہ کی نگاہ ہر وقت کہاں کہاں رہتی ہے، ہم لوگ تو غور وفکر کے بعد بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتے۔

مہمانوں کا اکرام احادیث میں اکرام ضیف کو ایمان کی علامت بتلایا گیا ہے حضرت کے یہاں اس کا اہتمام آخری حد تک تھا مہمانوں کی آمد تو وقت بے وقت ہوتی ہی رہتی تھی، مولانا مہمانوں کو مدرسہ کے ذمّہ کرنا نہ چاہتے تھے، اب اس کی صورت یہی تھی کہ اپنے گھر جو کچھ ہو یا ہوسکے وہ لے آئیں، اور بعض بہت ہی قریبی عزیزوں کے گھروں سے کچھ لے آئیں، مولانا کا کمرہ جو دارالضیافہ بھی تھا، اس میں ایک عدد المونیم کی سینی، چار المونیم کے پیالے اور ایک کپڑا جس میں مختلف رنگوں کے کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے، رکھا رہتا تھا، اگر بے وقت مہمان آتے تو حضرت خود یہ مذکورہ سامان اٹھاتے اور چل دیتے اپنے گھر اور عزیزوں کے گھروں سے کھانا لانے کیلئے جس جس کا گھر راستہ میں پڑتا جاتا آواز دیتے جاتے، اور ایک پیالہ پکڑاتے جاتے، صاحب خانہ اپنے گھر سے جو کچھ بھی ہوسکتا تھا، مدرسہ لیکر پہونچ جاتے، پھر حضرت اپنے گھر جاکر جو کچھ ملتا، یا جلد انتظام ہوسکتا لے آتے۔ میں الحمد للہ مولانا کے کسی حد تک قریب تھا، کبھی کبھی یہ کام میں نے بھی کیا ہے، مگر بہت کم، گاؤں کے لوگوں کا میرے ساتھ بھی بہت محبّت کا تعلق تھا، ایک دفعہ حضرت کی عدم موجودگی میں بے وقت مہمان آگئے، ایک بہت ہی قریبی دوست کے گھر جاکر میں نے بھی آواز لگادی، وہ گھر پر نہ تھے، بچوں کے ذریعہ اپنی بات اندر تک پہونچادی کہ مہمان آگئے ہیں، ایک پیالہ سالن یا دال دیدیں، اللہ انکی اہلیہ کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ انھوں نے بچّے کے ذریعہ پوری پتیلی باہر بھیج دی کہ مہمانوں کو کھلادیں جو بچ جائے واپس کردیں، ابھی بچّوں نے کھانا نہیں کھایا ہے،

اس گاؤں کے لوگ مہمان نوازی میں بے مثال تھے، حضرت گاؤں کے لوگوں کے احسانات کا جو مدرسہ کے ابتدائی زمانہ میں ان لوگوں نے کئے تھے بہت تذکرہ فرمایا کرتے تھے جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ میں حضرت کی اس سنت پر کبھی کبھی عمل کرلیا کرتا تھا لیکن حضرت کو یہ بات برداشت نہ تھی کہ میں کسی کے دروازے پر جاکر اس طرح آواز لگاؤں، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت کی کچھ طبیعت خراب تھی، گھر تشریف لے گئے تھے کہ بے وقت مہمان آگئے، میں نے یہ سوچا کہ حضرت کو زحمت ہوگی، خود ہی کچھ انتظام کرلیا جائے، وہی سینی اور کٹورے لیکر چلدیا، کسی ذریعہ سے مہمانوں کا حضرت کو علم ہوگیا، فوراً چلے آئے، ادھر میں مدرسہ سے نکل چکا تھا، راستہ میں ملاقات ہوگئی، حضرت کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے، اور فرمایا مولانا! سب کام آپ سے کرالیتا ہوں، یہ کام آپ سے نہیں کراؤنگا، پھر بڑے درد سے فرمایا یہ تو میرے نصیب ہی میں لکھا ہے۔

اصلاح بین الناس کی فکر

اللہ کے بندوں میں باہمی محبت والفت اور اچھے تعلقات کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، اور اس کے بالمقابل آپس کی لڑائی اور باہمی نزاع کو شریعت میں بہت ناپسند سمجھا گیا ہے، حضرت کو اصلاح بین الناس کی بڑی فکر رہتی تھی، خصوصاً وہ لوگ جو دیندار کہے جاتے ہیں، یا کسی دینی جماعت یا ادارہ سے وابستہ ہیں، جنکا اختلاف نہ صرف دو شخصیتوں یا دو گروہوں کا اختلاف ہوتا ہے، بلکہ اس کے نتائج بڑے دوررس اور دین کیلئے بڑے مضر ہوسکتے ہیں، ایسے لوگوں کے اختلافات کو دور کرنیکے لئے حضرت بڑی کوششیں فرماتے، اور جو کچھ بن پڑتا اس سے گریز نہ کرتے، ایک مدرسہ کے دو استاذوں میں کچھ اختلاف ہوگیا، اور بات کچھ حد سے متجاوز ہوگئی، حضرت نے ان دونوں کے درمیان صلح کرانی چاہی، ان میں سے

ایک تو راضی ہو گئے، لیکن دوسرے جن پر کچھ زیادتی ہو گئی تھی کسی طرح راضی ہونے اور دوسرے کے معافی مانگنے پر بھی معاف کرنیکے لئے تیار نہ تھے، حضرت نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی، میں اور ایک صاحب اور وہاں موجود تھے، جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، تو حضرت نے اپنی ٹوپی اتاری، اور انکے قدموں پر ڈالدی سملوگوں پر تو جیسے بجلی گر گئی، اور مجلس میں ایک سکتہ سا سب کو ہو گیا، لیکن حضرت کے اس عمل نے اپنا کام کر دیا، اور آخر ان کا دل بھی نرم پڑ گیا، اور انھوں نے بھی حضرت کے ارشاد کے مطابق مصالحت کرلی۔

اسی طرح کا واقعہ لکھنؤ کے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح وصفائی کرانے کے سلسلے میں بھی پیش آیا، اور جب کچھ پر جوش نوجوانوں کو مصالحت کے لئے حضرت کسی طرح تیار نہ کر سکے، تو آخر میں روتے ہوئے اپنی ٹوپی اتار کر ان کے قدموں میں ڈالدی، اور نتیجہ یہاں بھی اچھا ہی رہا، اور الحمدللہ ایک خطرناک قسم کا خون خرابہ ٹل گیا، اس قسم کے واقعات حضرت کی زندگی میں بار بار پیش آئے ہیں، اور انکی کوششوں نے کتنے ہی مسلمان خاندانوں اور دینی اداروں کو ہلاکت و بربادی سے بچالیا، میری نگاہوں نے "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کا مصداق حضرت سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔

آخری سفر جو سفر آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا، اس سے چند دن پہلے بھی حضرت اس حال میں کہ ٹانگ کے درد کی وجہ سے قدم زمین پر رکھنا مشکل تھا، ایک مدرسہ میں پیدا شدہ باہمی نزاع کو دور کرنیکے لئے باندہ سے سیکڑوں میل کا سفر کر کے ایک جگہ تشریف لے گئے تھے، اور واپسی میں لکھنؤ تشریف لائے تھے، میرے عرض کرنے پر کہ اس حال میں بھی آپ سفر سے باز نہیں آرہے ہیں، فرمایا کہ بہت مجبوری میں یہ سفر کیا ہے، اور بہت ضرورت اسکی تھی، اور یہ مذکورہ بالا بات بتلائی اور

فرمایا: الحمدللہ سفر مفید رہا، اہلِ مدرسہ اختلافات ختم کرنے پر راضی ہو گئے۔

مولانا کا بچپن کیسے گذرا

مولانا کی زندگی از اوّل تا آخر مجاہدانہ زندگی ہے پوری زندگی میں آرام و راحت اور سکون و اطمینان کبھی نصیب ہی نہیں ہوا، شاید ہی کسی بڑے عالمِ دین کی زندگی ایسی رہی ہو حضرت اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے، گاؤں میں اتنی غربت تھی کہ عام طور پر بچوں کو صبح ہی بکریوں کی طرح جنگل کو نکال دیا جاتا تھا بچے صبح سے شام تک جنگل میں رہتے، جس زمانہ میں گولر یا اس جیسی چیزیں ملتیں انسے پیٹ بھر لیتے، جنگلی بیروں کے زمانہ میں دن بھر وہی کھاتے پھرتے، جب چنے کا ساگ کھانے کے قابل ہوتا تو وہی پیٹ بھرنے کا ذریعہ ہوتا، اور شام کو گھر چلے آتے دوسرے دن بھی یہی ہوتا، اس کے بعد فرماتے تھے کہ چونکہ میں حفظ کرتا تھا، اس لئے مجھے روٹی مل جاتی تھی، میری دو چھوٹی چھوٹی بہنیں تھیں، انکو بھی عام بچوں کیساتھ صبح ہی گاؤں سے باہر بھیج دیا جاتا، میں اس پر روتا تھا، اور کہتا تھا کہ میں اپنی روٹی میں انکو شریک کر لونگا، لیکن میری ایک نہ چلتی تھی، یہ واقعہ جب بھی حضرت نے سنایا ہمیشہ آبدیدہ ہو جاتے اور آواز گلے میں پھنس جاتی تھی، یہ دونوں بہنیں کم عمری ہی میں انتقال کر گئی تھیں۔

ایثار و قربانی کے چند نمونے

حضرت مولانا کے گھر میں کھانے کا حال بہت ہی سادہ تھا عام طور پر سب ہی لوگ چٹنی، روٹی یا چٹنی چاول ہی کھاتے، یا اسی درجہ کا کوئی اور کھانا دلیہ یا مہیری پکا یا کرتا تھا، مہیر بندیل کھنڈ کا ایک خاص دیہاتی کھانا ہے، چاول کو چھاچھ یعنی مٹھا میں پکا لیا جاتا ہے، گاؤں میں بہت ہی کم گھر ایسے تھے، جن میں دونوں وقت دال روٹی چلتی ہو، حضرت کیلئے بھی گھر

سے موٹی موٹی دو روٹی، اور ان پر خشک چٹنی رکھی ہوئی چلی آئی تھی، اللہ جنت میں جنت کی اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں کھلائے، اس بندۂ خدا کو چٹنی پسند بھی بہت تھی جب میں شروع میں حاضر ہوا تو چند دن دونوں وقت حضرت کیساتھ کھانا کھاتا رہا، بعد میں پتہ چلا یہ دال اور سبزی کا تو میرے لئے اہتمام ہوتا ہے۔ مجھے تو حضرت رومال میں سے گیہوں کی چپاتی نکال کر دیتے، اور خود اسی رومال میں سے لقمہ توڑ توڑ کر ہی نکال کر کھاتے تھے، کئی وقت کے بعد یہ بھی پتا چلا کہ یہ صورت اسلئے اختیار فرمائی جارہی ہے کہ حضرت جوار کی روٹی کھارہے ہیں، اور گیہوں کی چپاتی کا اہتمام بھی صرف اس احقر کیلئے ہے، کھانے کا یہ ساتھ حضرت کے غیر معمولی مشاغل کی وجہ سے زیادہ دن نہ رہ سکا۔ ان کا نہ کوئی وقت متعین، نہ کھانا کھانا ہی طے تھا اسوقت بھی مشاغل کا یہ حال تھا کہ دوپہر کا کھانا شام تک رکھا رہتا، اور کھانے کی نوبت نہ آتی اور شام کو یونہی واپس چلا جاتا، بعد میں تو کھانا بس ایک ہی وقت کھاتے تھے، ناشتہ بھی غائب اور شام کو کھانا بھی بند۔ میں اس خانوادہ کی کیا کیا بات یاد کروں، ہر ہر بات پر آنسو نکل آتے ہیں، جب میں نے الگ کھانا شروع کر دیا تو مطبخ سے بہت ہی سادہ سی دال روٹی آجایا کرتی تھی، اور اکثر ہی بلکہ تقریباً روز ہی حضرت کے گھر سے ایک پیالہ میں یا چھوٹی سی المونیم کی پتیلی میں کبھی سبزی، کبھی دال آجاتی تھی۔ اس وقت تک مجھے حضرت کے گھر کے کھانے کا حال معلوم نہ تھا، تھوڑا آئے ہوئے شاید چند ہفتے ہی گذرے تھے، ایک دن میں کھانا کھانے کیلئے اپنے کمرہ میں بیٹھ چکا تھا کہ مولانا کی ایک بچی جس کی عمر اس وقت چھ سات سال ہوگی میرے لئے سبزی لیکر آئی، میں نے اس سے کہا کہ تم کھانا کھالو، اس نے کہا میں کھانا کھا چکی ہوں، میں نے بس یونہی مزید سوال کر لیا کہ کیا کیا کھایا، اس نے کہا کہ چٹنی چاول، میں

نے پوچھا یہ سبزی کیوں نہ کھائی، بھولی بھالی بچی نے گھر کی حقیقت صاف صاف بیان کر دی کہ یہ تو صرف آپ کیلئے پکتی ہے، یہ سننا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے اس سے کہا تم یہ واپس لے جاؤ، اس نے کچھ تکلف کیا، لیکن میرے اصرار پر واپس لے گئی، کچھ دیر کے بعد پھر لے آئی، لیکن میں نے کسی بچہ کے ہاتھ دوبارہ واپس کر دی، اور بعد میں میں نے حضرت سے اس کی شکایت کی، کہ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تو چٹنی کھائیں اور میرے لئے اہتمام سے سبزی یا اچھی سی دال بنا کر بھیجی جائے، مجھے آپ اتنا بے حمیت اور خود غرض نہ سمجھیں، حضرت نے اس واقعہ کو بالکل ہی اہمیت نہ دی، اور فرماتے رہے پتہ نہیں بچی نے آپ سے کیا کہہ دیا اور آپ اتنے متاثر ہو گئے، ارے بچے گھروں میں سب کچھ کھاتے رہتے ہیں، آخر میں، میں نے ہی ہار مان لی اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔

اس طرح کے واقعات حضرت کے یہاں کے روزمرہ کے واقعات تھے، خیر حضرت تو حضرت تھے، لیکن این خانہ ہمہ آفتاب بود۔ اس معاملہ میں حضرت کی اہلیہ مرحومہ کا کردار مجھے حضرت سے بھی بلند معلوم ہوتا ہے، وہ عورت ذات ایک مالدار بلکہ زمیندار خاندان کی پروردہ اپنی ذات پر ہی نہیں اپنی چھوٹی چھوٹی اولاد کے مقابلہ میں غیروں کو اس طرح ترجیح دیتی تھیں، اللہ نے کیسا دل گردہ اس بندی خدا کو عطا فرمایا تھا، الٰہی اس جنتی جوڑے کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ عنایت فرمائیے، اور مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کے ساتھ جو ان حضرات نے احسان اور لطف و کرم کا معاملہ کیا ہے اس کا اپنی شان عالی کے مطابق اجر عطا فرمائیے۔

میرے حافظہ میں اس طرح کے نہ جانے کتنے ہی واقعات پڑے ہیں، ایک واقعہ اور لکھتا ہوں، حضرت کی بڑی صاحبزادی کی شادی کو کچھ ہی دن گذرے تھے،

ان کی سسرال کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، غالباً انکو سسرال لیجانا تھا، ان حضرات کا قیام دو تین دن تھوڑا ہیں رہا، ان لوگوں کی کئی کئی رشتہ داریاں اس گاؤں میں تھیں، ایک دن انلوگوں کا رات کا کھانا مولانا کے ایک قریبی عزیز کے یہاں تھا۔ عصر کے بعد ذرا اچھی سی بارش ہوگئی، اور گاؤں کے راستے خراب ہوگئے جن صاحب کے یہاں دعوت تھی، انھوں نے حضرت کے گھر کھانا بھجوا دیا اور کہلا دیا کہ مہمان ہمارے یہاں تشریف نہ لائیں ان میں زحمت ہوگی، اللہ کا کرنا کہ مغرب کے کچھ دیر بعد کانپور کے کئی مہمان اچانک مدرسہ میں پہنچے، حضرت کو انکے کھانے کی فکر ہوئی گھر جاکر کانپور کے ان مہمانوں کا ذکر کیا، اور معلوم کیا کہ کھانے کو کچھ ہے اہل خانہ نے پوری بات بتلا دی اور یہ بھی کہ ہملوگوں کی دعوت بھی چونکہ وہاں تھی اس لئے ہمارے لئے بھی کھانا وہیں سے آیا ہے گھر کچھ نہیں پکا ہے حضرت نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ یہ کھانا مدرسہ بھیج دو، اور تم لوگ کچھ دلیہ یا چاول وغیرہ پکالو! وہاں سے جو بچ جائے گا آجائیگا! اور یہی ہوا گھر سے وہ کھانا آگیا، کانپور کے مہمانوں نے کھایا، اور جو بچا وہ اپنے مہمانوں کو کھلا دیا، اپنے سمدھیانہ کے مہمانوں کے مقابلہ میں مدرسہ کے مہمانوں کو ترجیح دینا بڑا مشکل کام ہے۔

ایک دفعہ حضرت کو کانپور تشریف لیجانا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کانپور تشریف لانے والے تھے، دوپہر کا وقت تھا، جلد از جلد اسباق سے فارغ ہوئے، اور مدرسہ سے متعلق بہت سے کام انجام دئے، میں نے جلدی سے گھر سے کھانا منگوالیا، کھانا وہی دو روٹی اور چٹنی۔ حضرت سے کھانے کیلئے عرض کیا، حضرت نے کسی قدر جھلاہٹ کے ساتھ فرمایا، آپ کو کھانے کی پڑی ہے مجھے بہت عجلت ہے، میں نے پھر عرض کیا، حضرت نے پھر انکار کر دیا، لیکن میں نے ذرا اصرار اور پختگی کے ساتھ اپنی

درخواست عرض کی، تو ایک روٹی کھالی اور کانپور چلے گئے، چوتھے دن دوپہر میں میرے نام حضرت کا ایک پرچہ نومیل سے آیا (نومیل حضرت کے مدرسہ سے ڈیڑھ میل دور سڑک پر ایک جگہ ہے جو باندہ سے نومیل پر ہے، وہاں کوئی آبادی نہیں ہے اسی لئے اس جگہ کا نام ہی نومیل پڑگیا ہے، آنیوالی بسیں تھوڑا کی سواریوں کو وہیں اتار دیتی ہیں، اور باندا جانیکے لئے وہیں سے مسافر سوار ہوتے ہیں) اس پرچے میں لکھا تھا، میرا کھانا اور ایک لوٹے میں پانی لیکر کسی طالبعلم کو بھیج دیجئے، اور دو تین سائیکلوں کا انتظام کرکے بھجوادیجئے، میں مدرسہ کی دال لایا ہوں۔ میں نے کھانا اور پانی تو فوراً دو لڑکوں کے ہاتھ سائیکل سے بھیج دیا، اور یہ کہلادیا کہ ۔۔ مزید سائیکلیں ابھی بھیج رہا ہوں، اور ان دونوں طالبعلموں سے کہا کہ جب حضرت کھانا کھالیں تو تم میں سے ایک دال کی نگرانی کیلئے وہیں رک جائے اور دوسرا حضرت کو سائیکل پر بیٹھا کر لے آئے، ان لڑکوں نے یہی کیا، حضرت تشریف لے آئے اور آتے ہی سلام کے بعد مجھ سے فرمایا: کشف ہوگیا تھا کیا؟ میں کچھ نہ سمجھ سکا، تو دوبارہ فرمایا: کشف ہوگیا تھا کیا؟ میں نے عرض کیا حضرت میں سمجھا نہیں، اس پر فرمایا کہ آپنے جو ایک روٹی اصرار کرکے کھلادی تھی وہی کھائی تھی یا اب آپ کا بھیجا ہوا کھانا کھاکر آرہا ہوں، میں نے عرض کیا حضرت کانپور میں کسی نے آپ کو کھانا نہیں کھلایا، فرمایا کسی نے بھی نہیں کھلایا۔ حضرت سے کھانیکے لئے اصرار کرنیکی ہمت کم ہی لوگوں کو ہوتی تھی، ورنہ اہل کانپور تو بچھے جاتے تھے۔

اپنے لئے احتیاط ہی پسند تھی

مولانا کے یہاں اساتذہ کی تنخواہیں تو واقعی کم تھیں، لیکن اور بہت سی سہولتیں ایسی تھیں جن سے تنخواہوں کی کمی کی تلافی ہوجاتی تھی، مثلاً اساتذہ کو مکانات بہت ہی کم کرایہ پر دئے جاتے تھے، اور حتی الوسع ہر خواہشمند استاذ کو مولانا مکان فراہم

کرا دیتے تھے، اسی طرح مطبخ کیلئے جو غلّہ تیل وغیرہ فصل کے موقع پر خریدتے تھے، اس میں اساتذہ کے گھروں کے خرچ کا بھی لحاظ کرکے خریدتے تھے، اور فصل کے موقع پر جس نرخ سے غلّہ خریدا گیا تھا اسی نرخ سے سال بھر اساتذہ کو دیتے رہتے تھے، یہ سامان قرض بھی دیدیا جاتا تھا، اور قیمت قسط وار تنخواہ سے کٹتی رہتی تھی۔ رمضان المبارک سے پہلے شعبان میں رمضان کے خرچ کیلئے چاول، دالیں اور تیل وغیرہ مطبخ کے بند ہونے سے پہلے ہی دیدیا جاتا تھا، جس سال مولوی حبیب صاحب (حضرت کے بڑے صاحبزادہ) مدرس ہوئے ہیں، اس سال شعبان کا واقعہ ہے کہ مطبخ کے ذمہ دار عام اساتذہ کو یہ سامان دے رہے تھے، مولوی حبیب صاحب اتفاقاً ادھر سے گذرے (اسوقت مطبخ اتنا اندر نہ تھا) تو انھوں نے مولوی حبیب صاحب سے کہا آپکو بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لیں، آپ بھی تو اب استاذ ہو گئے ہیں، مولوی حبیب نے انکے کہنے پر دو یا تین کلو چنے کی دال قیمتاً لے لی، وہ دال لیکر نکل رہے تھے، اور ادھر سے حضرت تشریف لے آئے، دریافت فرمایا کیا ہے؟ آواز میں کرختگی تھی، بیچارے مولوی صاحب تو گھبرا گئے، غالباً مطبخ کے ذمہ دار نے انکی طرف سے عرض کیا ۳ رکلو دال نقد قیمت دیکر لی ہے، میں نے حضرت کے غضب کا ایسا حال کبھی نہ دیکھا تھا، انتہائی سخت آواز میں مولوی حبیب احمد کو ڈانٹا اور فرمایا تمہارے باپ کا مال ہے، میں بھیک مانگ کر تمہارے لئے لاتا ہوں؟ میں فوراً پہونچ گیا، اور عرض کیا یہ بھی تو مدرس ہیں، اور یہ سہولت تو سبھی مدرسین کیلئے ہے، لیکن حضرت کا غضب کسی طرح کم نہ ہوا، ہم سبھی لرز گئے، بیچارے مولوی حبیب احمد صاحب کا تو برا حال تھا کسی طرح مطبخ واپس گئے اور وہ دال واپس کی۔

اپنے اور اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں حضرت کی احتیاط کا یہی حال تھا،

مدرسہ سے نہ کبھی تنخواہ لی، اور نہ کوئی اور سہولت اپنے لئے یا اپنی اولاد کیلئے مدرسہ سے حاصل کی جس زمین میں مدرسہ بنا ہوا ہے اس کا اکثر حصہ مولانا کے اہل خاندان یا اعزہ کی ملکیت تھا نیز جس کمرہ میں حضرت کا قیام تھا وہ بھی حضرت ہی نے اپنے لئے بنوایا تھا، مدرسہ کی رقم اس میں صرف نہ کی تھی، مدرسہ کے کاموں سے سفر کرنا ہوتا تھا، تب بھی حتی الوسع مدرسہ سے کرایہ نہ لیتے، اور سفر میں کوئی معمولی سی تجارت کر لیتے جس سے کرایہ نکل آتا، مدرسہ کے ایک استاذ مولانا سعد اللہ صاحب کی کرانہ کی دوکان تھی، کانپور تشریف لے جا رہے تھے فرمانے لگے مولوی سعد اللہ صاحب بتلائیے آپکی دوکان کیلئے کانپور سے کیا لیتے آئیں جس سے ہمارا کرایہ نکل آئے، مولانا سعد اللہ صاحب نے عرض کیا حضرت سن لائٹ صابن ہمیں باندا میں اس قیمت کا ملتا ہے، کانپور میں آپکو اس سے کم قیمت پر ملجائے گا، ایک پیٹی صابن لے آئیں ہم لے لیں گے، آپ کا کرایہ نکل آئیگا، مولانا کانپور سے واپسی میں ایک پیٹی سن لائٹ صابن لے آئے، اور مولانا سعد اللہ صاحب کو دیدیا، اس میں صابن کی قیمت اور مولانا کا کرایہ بھی نکل آیا، اور کچھ عدد سن لائٹ صابن بچ رہے، فرمایا یہ غریب طلبا کے کام آجائیں گے۔

زندگی مسلسل سفر تھی

حضرت کے اسفار کا حال تو عام طور پر لوگوں کے علم میں ہے ہی، یہ سفر پیدل، سائیکل، بیل گاڑی، موٹر سائیکل، ٹرک، بس اور ٹرین سے ہر طرح فرماتے تھے، کاموں کے ہجوم کی وجہ سے کہیں قیام نہیں فرماتے تھے، اول سفر اور آخر سفر پھر جن حضرات کی دعوت پر سفر فرماتے تھے، انمیں بعض تو بہت ہی خود غرض ہوتے تھے، انکا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ حضرت تشریف لے آئیں خواہ حضرت پر کچھ بھی گذر جائے، اور اللہ کے بندے کسی راحت رسانی کا اہتمام بھی نہیں کرتے تھے، مجھے بھی حضرت کے ساتھ

بارہا ایسے سفر کرنے پڑے ہیں، لیکن ساری مصیبتوں اور اسفار کی صعوبتوں کے باوجود کبھی زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا، بہت سے اللہ کے بندے تو واجبی کرایہ تک نہ دیتے تھے، کئی بار تو ایسا ہوا کہ لوگ دور دراز دیہات میں لے گئے، اور واپسی کا کوئی نظم نہیں کیا، حضرت کو خود نظم کر کے واپس آنا پڑا، جب تک جان میں جان رہی کسی کی دل شکنی نہیں کی خواہ کچھ بھی گذر جائے، جو باتوفیق بندے کرایہ پیش بھی کرتے تو اولاً تو حضرت انکار فرماتے، اور اگر وہ اصرار کرتے تو صرف بقدر ضرورت ہی کرایہ لیتے، ایک صاحب نے جن کے یہاں حضرت تشریف لے گئے تھے، میرے ذریعہ حضرت کی خدمت میں فرسٹ کلاس کے کرایہ کے حساب سے رقم پیش کی، حضرت نے فرمایا یہ رقم تو بہت زیادہ ہے، انھوں نے کہا کہ میں اپنی ذاتی رقم میں سے یہ پیش کر رہا ہوں، مدرسہ کے پیسے نہیں ہیں، میری درخواست ہے کہ آپ فرسٹ کلاس سے تشریف لے جائیں، یہ سن کر فرمانے لگے مسلمانوں کے پیسے اس کام کے لئے ہیں؟ میں ساری رات اسٹیشن پر پڑا رہوں گا لیکن فرسٹ کلاس سے نہ جاؤنگا۔

مولانا کے اسفار میں سے بعض اسفار ایسے ہوتے تھے جو ہم لوگوں کی نظر میں بالکل غیر ضروری ہوتے تھے لیکن حضرت کی دور رس نگاہ میں اس کے بہت سے دینی فائدے ہوتے تھے، ایک بار دوپہر کو اسباق سے فارغ ہو کر سائیکل کے ڈنڈے پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے، میں نے مقصدِ سفر معلوم کیا تو کافی کریدنے کے بعد بتلایا، فلاں گاؤں میں ایک بچے کی ختنہ ہے، مجھے واقعی حضرت کا یہ سفر بہت ناگوار ہوا میں نے عرض بھی کر دیا کہ یہ بھی کوئی وجہ سفر ہے، حضرت مولانا نے فرمایا "مولانا انکی نکنی تنی میں شریک ہو کر میں نے انکو دین کی بات پہنچائی ہے" یہ مولانا ہی کے الفاظ تھے۔ کافی دنوں کے بعد سمجھ میں آیا کہ اس طرح کی تقریبات میں شرکت

کرنے سے دین کے کام کیلئے کیسے راستے ہموار ہو گئے ہیں یہ

خدمتِ خلق

حدیث شریف میں خدمت خلق کی بڑی عظمت بیان فرمائی گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اللہ کی مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، جو لوگ مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں۔ وہ اللہ کو بہت محبوب ہوتے ہیں، خدمتِ خلق کے معاملے میں بھی حضرت اپنی مثال آپ تھے، کسی کی کسی طرح کی بھی ضرورت ہو، خواہ بچوں کی شادی بیاہ یا مریضوں کے علاج و معالجہ کا مسئلہ یا کسی کو ملازمت دلوانا اور اس سلسلے میں کوشش کرنا، حضرت سے وہ عرض کردے یا کسی طرح حضرت کے علم میں آجائے، اب بس حضرت پر گویا واجب ہو گیا کہ اس کی جو مدد بھی کر سکتے ہوں، کریں، کتنے ہی مریضوں کے ساتھ بمبئی، کانپور لکھنؤ، باندہ شہر اور اللہ جانے کہاں کہاں کا سفر کرتے تھے، اور انہیں دامے درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کی مدد فرماتے تھے، ایسے لوگوں کی تعداد جن کی ملازمتوں کیلئے حضرت نے کوشش کی سیکڑوں نہیں ہزاروں ہوگی، شادی کرانے کا تو ہمارے حضرت نے ٹھیکہ لے رکھا تھا، کتنے ہی لوگ ہونگے جنکے گھر حضرت نے بسائے ہونگے، اور وہ اس سلسلہ میں حضرت کے مرہون منت ہونگے۔

وقت کی قیمت کا احساس

دنیا میں ہر چیز کا بدل مل سکتا ہے، لیکن وقت ایسی چیز ہے کہ اگر وہ ضائع ہو جائے تو اس کی "تلافی" ناممکن ہے، اور ہم لوگوں میں سب سے زیادہ ناقدری کا شکار ہمارے اوقات ہی ہیں۔ مولانا کے نزدیک اپنے وقت کی بڑی قدر و قیمت تھی وہ جن کاموں میں اپنے اوقات کو صرف کرتے تھے، انکو دین سمجھ کر ہی اپنا وقت لگاتے تھے، مدرسہ میں بڑی بڑی اور مشکل کتابوں کے پڑھانے کیساتھ ساتھ تعمیرات کا انتظام بلکہ عملاً اس کے کاموں میں شرکت، مدرسہ کے مطبخ

کی فکر، اور اس کیلئے بھی وقت خرچ کرنا، مہمانوں کی میزبانی بلکہ انکے لئے ہر طرح کے اکرام اور راحت رسانی کی فکر، اور روزانہ ہزاروں نہ سہی سیکڑوں کے اوسط سے تو یقیناً تعویذوں کا لکھنا، اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تصنیف وتالیف کا بھی سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا تھا۔ اپنے معمولات سفر و حضر میں بھی نہ چھوڑتے تھے، بلکہ سفر میں تو تلاوت کا زیادہ ہی اہتمام فرماتے تھے، میں ایک بار بمبئی کے سفر میں ساتھ تھا، لکھنؤ سے یہ سفر ہوا تھا، کانپور میں بھی کچھ حضرات ملنے کیلئے آئے پھر جھانسی میں بھی کچھ لوگوں نے ملاقات کی، ضرورتمندوں کو بھی حضرت کا پروگرام معلوم رہتا تھا، جھانسی سے رات کے دو بجے کے قریب گاڑی چلی تھی، مجھے تو دوبارہ نیند آگئی لیکن حضرت اپنی تہجد میں مشغول ہو گئے، ۳ بجے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نماز سے فراغت کے بعد دعا و مناجات میں مشغول ہیں، بمبئی کا یہ سفر بمبئی کے بعد بھٹکل کرناٹک تک تھا، بھٹکل کے قریب انتہائی حسین وجمیل قدرتی مناظر ہیں، سفر کے دوران میں انکو دیکھنے لگا، اور ایک دو بار حضرت کو بھی متوجہ کیا، حضرت ایک لمحہ کیلئے توجہ فرماتے، اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے، میں نے ایک بار مزید عرض کر دیا کہ حضرت دیکھئے تو کتنا حسین منظر ہے، حضرت نے قدرے بیزاری کے ساتھ فرمایا کہ ان کا کیا دیکھنا۔ اور اپنے کام یعنی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔

غیرت اور دینی حمیت

مولانا کے مزاج میں انتہائی انکساری اور تواضع کے باوجود غیرت و استغناء اور دینی تصلّب بہت تھا، کبھی کسی نے نہیں دیکھا ہو گا کہ مولانا نے کسی بھی دنیوی غرض سے خواہ وہ مدرسہ ہی کی کیوں نہ ہو کسی کی خوشامد کی ہو، میری مدرسی کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے، حضرت نے سنایا کہ باندہ شہر کے فلاں صاحب نے

ایک صاحب کے متعلق جو کچھ مالدار تھے ذکر کیا کہ وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، مولانا نے فرمایا میں خود حاضر ہو جاؤں گا لیکن یا تو مولانا بھول گئے، یا کثرتِ مشاغل نے ملاقات کا موقع نہیں دیا، چند دنوں کے بعد ان صاحب نے پھر تقاضہ کیا، اور یہ بھی ذکر کر دیا کہ وہ آپکے مدرسہ کو پانچ سو روپئے دینے کا تذکرہ کر رہے تھے، اس وقت پانچ سو روپے کی بہت اہمیت ہوتی تھی، ایک مدرس کی آٹھ دس مہینہ کی تنخواہ تو کم از کم اس سے ادا ہو ہی جاتی تھی، لیکن مولانا کی غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ روپیوں کیلئے مولانا ان سے ملنے جائیں، آخر انھوں نے وہ رقم خود بھیج دی، اور بعد میں حضرت ان سے ملاقات کرنے کے لئے گئے۔

دینی تصلّب اور کسی کی بھی خاطر مداہنت نہ کرنا بھی حضرت کی بہت نمایاں خوبی تھی، لیکن زبان سے اس کا ذکر نہ کرتے تھے، عملاً بہت پختہ تھے، ایمرجنسی کے زمانہ میں باندہ ضلع کے کلکٹر جو شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، اور ایک وزیر جو مسلمان ہی تھے، مولانا سے نس بندی کے جواز پر فتویٰ لینے کیلئے حاضرِ خدمت ہوئے، حضرت اسوقت باندہ شہر کی جامع مسجد میں معتکف تھے، رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا، مولانا نے بہت ہی نرم کلامی سے کام لیا، اور ان سے یہ فرمایا کہ ہمارے بڑے لکھنؤ اور دہلی میں موجود ہیں، آپ ان سے فتوے لے لیں ہر ہر شخص سے فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن وہ لوگ تو مولانا ہی سے جواز کا فتویٰ لینا چاہتے تھے، اپنی درخواست پر مصر رہے، اثنائے گفتگو میں کلکٹر صاحب کی زبان سے یہ نکل گیا، مولانا آپ اس کی فکر نہ فرمائیں کہ کوئی شخص آپ کے خلاف ایک لفظ زبان سے نکال سکتا ہے، مولانا کو اس پر بہت غصہ آیا اور فرمایا کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں جائز اور ناجائز کا فتویٰ لوگوں کی ناراضی اور رضامندی کی بنیاد پر اور ان کے خوف اور بے خوفی کی بنیاد پر دونگا؟ لہجہ

سخت تھا، اس لئے کلکٹر صاحب کے مصاحبین میں سے کسی نے کہا، مولانا آپ کو معلوم ہے آپ کس سے بات کر رہے ہیں، مولانا نے اسی سخت لہجہ میں جواب دیا کہ میں جانتا ہوں یہ کلکٹر ہیں اور یہ وزیر، اور پھر یہ بھی کہا کہ جو کچھ آپ حضرات کر سکتے ہوں کر لیں، میں نس بندی کے جواز کا فتویٰ نہیں دونگا۔

آخر وہ بیچارے چلے آئے، اور مولانا کی مقبولیت کی وجہ سے کچھ کرنے کی ہمت نہ کر سکے، ورنہ ایمرجنسی کا دور تو بس العیاذ باللّٰہ۔

کشف و کرامات کوئی زیادہ کمال کی چیزیں نہیں ہیں

اللّٰہ جانے لوگوں نے حضرت کی کیا کیا کرامات گڑھ رکھی ہیں، ہم لوگوں نے تو اس بندۂ خدا کی مجاہدانہ زندگی، اتباع سنّت، اور بے مثال اخلاص وایثار کے سوا کوئی معروف قسم کی کرامت نہیں دیکھی، بلکہ بعض سنی سنائی کرامتوں کی حضرت سے تصدیق کی تو حضرت نے نفی ہی فرمائی۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے ایک دن فرمانے لگے یہ کشف و کرامات کوئی مشکل کام نہیں، ذرا سی ریاضت اور لوگوں سے اجتناب اور عزلت نشینی سے یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں، اور فرمایا جس زمانہ میں میں پانی پت میں پڑھتا تھا تو اکثر وقت اپنے کمرے میں گذارتا اور لوگوں کے اختلاط سے بہت پرہیز کرتا تھا، اسوقت مجھے بہت صحیح کشف ہونے لگا تھا، اور اپنے کشف کا ایک واقعہ بھی سنایا، فرمایا کہ ایک بہت ہی صحتمند سرحدی نوجوان کے متعلق مجھے یہ کشف ہوا کہ اسکو کل پولیس پکڑ کر لے جائیگی، میں نے اس نوجوان سے تنہائی میں اسکا ذکر کیا، اس نے مجھ سے کہا کیا آپ مجھ سے واقف ہیں، میں نے کہا کہ بس اتنا ہی کہ آپ اس مدرسہ کے طالب علم ہیں، تو اس نے اپنا قصہ سنایا کہ میں نے اپنے علاقہ میں انگریز حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا،

اور جب خطرہ محسوس ہوا تو مخفی طور پر یہاں آکر طالبعلمی کرلی ہے، مجھے یہ تبلاکر یہ طالب علم اسی وقت مدرسہ سے غائب ہوگیا، دوسرے دن انگریز پولیس نے پورا مدرسہ گھیر لیا، اور ایک ایک کونہ کی تلاشی لے ڈالی، انکا افسر بار بار یہی کہتا تھا کہ ہمارے خفیہ محکمہ کی رپوٹ غلط نہیں ہوسکتی، وہ طالب علم کل تک یہیں تھا، اہل مدرسہ نے جو حقیقت حال سے ناواقف تھے پوری سچائی سے تبلادیا کہ ہاں اس اس شکل کا طالبعلم کل تک تو یہاں تھا، مگر اب یہاں نہیں ہے، اور اس سے زیادہ ہمیں کچھ علم نہیں، اپنے کشف کا یہ قصہ سنانے کے بعد حضرت نے یہ بھی فرمایا، مگر اب یہ بات نہیں ہے۔

حضرت کے مزاج میں بڑی شگفتگی تھی، کبھی کبھی اساتذہ اور طلبہ سے مزاح بھی فرماتے تھے، اہل لکھنؤ کی نزاکت پر تنز کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ لکھنؤ کی ایک عورت اپنے شوہر سے خفا ہوگئی اور کہنے لگی کوئی ایسا بھی تو نہیں جو دو پیسے کی ارہر کی دال لادے اور میں اسے کھاکر خودکشی کرلوں، اسی طرح لکھنؤ کے ایک بگڑے نواب کا قصہ ذکر فرماتے تھے کہ انکے گھر میں سانپ نکل آیا تو کہنے لگے کوئی مردوا بھی تو نہیں کہ سانپ ماردے، گھر کی ملازمہ نے کہا حضور آپ بھی تو مرد ہیں؟ کہنے لگے اے ہاں! ہم بھی تو مرد ہیں، یہ قصہ سنا کر حضرت خوب ہنسا کرتے تھے، جن لوگوں نے حضرت کو ان آخری آٹھ دس سال ہی میں دیکھا جب اسفار اور کاموں کی تھکن اور فکروں نے حضرت کو بالکل بجھادیا تھا، وہ حضرت کی اس بے تکلفی اور شگفتگی کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔

آخر میں قارئین سے حضرت کے لئے دعائے مغفرت اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے، نیز یہ بھی دعا فرمائیں کہ اللہ حضرت کے نائبین کو صحیح معنی میں حضرت کا جانشین بنادے۔

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

علم تجوید کے ایک دردمند محرک

(ولادت ۱۳۴۱ھ وفات ۱۴۱۸ھ)

از- مولانا قاری ابوالحسن اعظمی - صدر شعبۂ تجوید و قراءت دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا القاری سید صدیق احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً و مغفرۃً کاملۃً کی حیات اور آپکے علمی و اصلاحی کارناموں سے متعلق ملک و بیرون ملک کے رسائل اور مستقل سوانحی کتابوں میں ارباب قلم نے لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھیں گے، آپ کی حیات کے ہمہ جہتی گوشوں سے متعلق موضوعات مثلاً:

آپ کا بچپن کیسے گذرا ـــ ابتدائی طالبعلمی ـــ تعلیم و فراغت ہتھورا جیسے مقام میں جامعہ عربیہ کا قیام اور اس کا محرک ـــ تعمیر مسجد میں آپکی محنت اور جدوجہد ـــ آپ کی تدریسی زندگی ـــ آپ کا اندازِ درس اور درسی خصوصیات ـــ طلبہ، اہل علم اور خواص و عوام کے ساتھ حسن سلوک ـــ دعوت و اصلاح ـــ ایثار و قربانی ـــ مزاج و طبیعت، تواضع و انکساری ـــ وعظ و نصیحت ـــ اور، شیخ بافیض وغیرہ پر مضامین مختصر اور مفصّل لکھے گئے ہیں، مجھے ذیل میں اختصار کے ساتھ آپکی تعلیم تجوید و قرارت، اس علم میں آپ کا شغف و انہماک

اور اس میں حذاقت و مہارت کی جانب اشارہ کرنا ہے۔
علماء اور فقہاء کے نزدیک "القرآن" کے اصطلاحی معنی ہیں:۔
"کلامُ اللهِ تَعالیٰ المُعجِز، المنزّل علی خاتمِ الانبیاء والمرسلین مُحمّدٍ صلّی اللهُ علیه وسلّم بواسطة الأمین جبرئیل علیه السّلام المکتوبُ بالمصاحفِ، المنقول الینا بالتّواتُر، المتعبد بتلاوته، المبدوء بسورة الفاتحة المختوم بسورة النّاس"
"یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام، کلام معجز، جو پیغمبر خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا بواسطہ جبرئیل امین علیہ السلام، جو مصاحف میں مکتوب ہے، جو ہم تک بالتواتر منقول ہے، جسکی تلاوت کیجاتی ہے، جس کا آغاز سورۂ فاتحہ سے ہے، اختتام سورۂ ناس پر ہے" قرآن کریم کی یہ تعریف نہایت جامع و مانع ہے۔
المنزل علی محمدٍ کی قید سے وہ تمام کتب سماوی خارج ہوگئیں جو دیگر انبیاء کرام پر نازل کی گئیں، المعجز اور المتعبد بتلاوته سے احادیث قدسیہ خارج ہوگئیں کیونکہ یہ معجزہ نہیں، اور غیر متلو ہیں۔ المنقول، المتواتر سے قرآن کریم کی تمام منسوخ التلاوۃ آیات اور تمام غیر متواتر قراءات خارج ہوگئیں۔
قرآن کریم نہ صرف الفاظ اور نہ صرف معانی بلکہ الفاظ اور معانی کے مجموعے کا نام ہے "هُوَ النَّظمُ وَالمعنیٰ جَمِیعًا"۔
قرآن کریم عربی مبین، فصیح زبان میں نازل ہوا ہے، اسکے ایک ایک حرف کی مستقل الگ الگ صوت و آواز ہے، کسی لفظ کے ہر ہر حرف کو جب تک صحیح مخرج و صفت کے ساتھ جیسا کہ وہ نازل کیا گیا ہے نہ ادا کیا جائے گا، تو اس سے صحیح معانی کا ترتب مشکل ہوگا، اس زبان کا معاملہ دیگر زبانوں جیسا نہیں ہے،

بالفاظ دیگر عربی زبان بیحد حساس زبان ہے، اس زبان کو اتنی حساس بنانیوالی چیز آخر کیا ہے؛ تو خوب واضح رہے کہ یہ چیز صرف علم تجوید و قرارت ہے، یہی وہ اہم علم ہے جسکی رعایت سے قرآن کریم کا ہر حرف اور ہر حرکت ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ سے اور صحیح انداز پر جس طرح وہ نازل ہوا ہے ادا ہوتا ہے، اس علم کے بغیر اس زبان کی ساری حساسیت دھری رہ جاتی ہے۔

حضرت مولانا ایسے عالم نہیں تھے جو محض زبانی طور پر تو یہ کہتے رہیں کہ: "یہ زبان عربی بیحد حساس زبان ہے" بلکہ وہ ایک حساس عالم دین تھے، اور علم اور دین دونوں کے پورے تقاضوں سے مکمل واقفیت رکھنے والے تھے،

آپکا سلسلۂ علم تجوید و قرارت

باندہ میں جب مسلم نوابوں کی حکمرانی ہوئی، تو جس گھرانے کی خدمات زیادہ وسیع پیمانے پر حاصل کی گئیں، ان میں نواب ذوالفقار علی بہادر مرحوم علم نواز، اور دیندار تھے، انکو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے بیعت کا شرف حاصل تھا، حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کے بعد شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے دینی، تربیتی و تعلیمی رہنمائی حاصل کرتے تھے، نواب صاحب کی درخواست پر شاہ اسحاق صاحبؒ نے مولانا قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتیؒ کو باندہ بھیجا، قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتیؒ کا نواب صاحب کے قائم کردہ مدرسہ اور حضرت مولاناؒ کے گھرانے سے گہرا ربط ہوگیا تھا، اور یہ دیرینہ ربط و تعلق برابر قائم و باقی رہا انھیں دیرینہ روابط کی بنا پر حضرت مولاناؒ تعلیم کیلئے پانی پت بھی تشریف لیے گئے۔

پانی پت کے زمانۂ قیام میں دیگر درسی کتابوں کے ساتھ آپنے بقیۃ السلف امام القراء حضرت المقری فتح محمد صاحب پانی پتیؒ سے علم القرارت میں شرف تلمذ حاصل کرنے کی درخواست کی، حضرت امام القراء بڑی مصروف زندگی گذارنے

والے بزرگ تھے، سلف کی عظیم یادگار تھے، آپکی درخواست پر فرمایا کہ: مجھے بالکل فرصت نہیں ہے، ہاں! فجر کی اذان سے پہلے تہجد کے وقت تھوڑا سا وقت مل سکتا ہے، اگر اسوقت پڑھ سکو تو پڑھا دونگا، حضرت مولانا تو سراپا اشتیاق تھے، طلب صادق تھی، فوراً تیار ہو گئے اور اس طرح تہجد کے وقت آپ نے اس ولی کامل سے قراءات پڑھیں۔

ایک طرف تہجد کا بیش قیمت اور بابرکت وقت، اور دوسری طرف ایسا کامل العلم و امام الفن بزرگ استاذ اور تیسری طرف آپ جیسا صادق اور سراپا اشتیاق طالب علم، آپ کی سچی تڑپ اور طلب، حضرت الاستاد کی توجہ خاص، اور تہجد جیسے بابرکت وقت میں اللہ رب العزت نے کیا کچھ نوازا ہوگا، اسے کون سمجھ سکتا ہے، البتہ بعد کی زندگی میں اس علم و فن سے والہانہ تعلق، اس کی ترویج و اشاعت کا غایت درجے شوق و شغف، قراء سے محبت اور انکی عزت و تکریم سے ضرور کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

۱۳۵۹ھ میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس نظامی کی کتب مشکوٰۃ شریف ہدایہ آخرین، اور ملا حسن وغیرہ پڑھتے ہوئے حضرت المقری عبداللہ صاحب مرادآبادیؒ سے بھی علم قراءت میں استفادہ کیا۔

ذیل میں علم القراءات میں آپ کا سلسلۂ اسناد درج کیا جاتا ہے۔

نمبر۱ مولانا قاری صدیق احمد صاحبؒ نمبر۲ المقری فتح محمد صاحبؒ نمبر۳ ابو محمد محی الاسلام عثمان پانی پتیؒ نمبر۴ عبدالرحمٰن اعمیؒ نمبر۵ عبدالرحمٰن محدث ابن قاری محمدیؒ (و قاری نجیب اللہ و قاری کبیر الدینؒ) نمبر۶ امام الدین امروہوی نمبر۷ محمد عرف کرم اللہ دہلویؒ (و قاری قادر بخشؒ و قاری محمدی)، نمبر۸ شاہ عبدالمجید دہلویؒ نمبر۹ غلام مصطفیٰ ابن شیخ محمد اکبر تھانیسری، ثم دہلویؒ نمبر۱۰ غلام محمد گجراتی، ثم دہلویؒ نمبر۱۱ عبدالغفور دہلویؒ نمبر۱۲ عبدالخالقؒ نمبر۱۳ شمس الدین

محمد ابن اسماعیل ازہری اعمی ؒ ۱۴ عبدالرحمٰن ابن شیخ شحاذہ یمنی ؒ ۱۵ شہاب احمد ابن عبدالحق سنباطی ؒ ۱۶ شیخ شحاذہ یمنی ؒ ۱۷ ابو نصر طبلاوی ؒ ۱۸ شیخ الاسلام قاضی زکریا انصاری ؒ ۱۹ رضوان الدین ابو نعیم ابن احمد ؒ (و شیخ برہان الدین قلقیلی ۲۰ محقق امام شمس الدین ابو الخیر محمد بن الجزری ؒ ۲۱ امام ابو العباس احمد حنفی دمشقی ۲۲ امام ابو عبداللہ حسین ابن سلیمان بن فزارہ ؒ ۲۳ ابو القاسم عبدالرحمٰن عرف ابو شامہ دمشقی ؒ ۲۴ ابو الحسن علی ابن محمد سخاوی ؒ ۲۵ ولی اللہ ابو محمد قاسم ابن فیرہ شاطبی ؒ ۲۶ ابو الحسن علی بن ہذیل اندلسی ۲۷ ابو داؤد سلیمان ابن خلف ۲۸ ابو عمرو عثمان بن سعید دانی ؒ ۲۹ ابو الحسن طاہر ابن غلبون ؒ ۳۰ ابو الحسن علی بن محمد ہاشمی ؒ اعمی ۳۱ ابو العباس احمد اُشنانی ؒ ۳۲ ابو محمد عبید اللہ ابن صباح ؒ ۳۳ ابو عمرو حفص کوفی ؒ ۳۴ عاصم کوفی ؒ ۳۵ زر بن حبیش اسدی ؒ (و عبداللہ بن حبیب سلمی ؒ و سعد ابن الیاس شیبانی ؒ) ۳۶ حضرت عثمان غنی رضؓ حضرت علی رضؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ، حضرت ابی ابن کعب رضؓ، حضرت زید ابن ثابت رضؓ ۳۷ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی اصحابہ واہلہ اجمعین۔

اللہ کے ولی کی ایک کھلی ہوئی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام قرآن کریم سے کتنا تعلق رکھتا ہے، اسکی تلاوت سے اسے کس قدر شغف ہے، سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خُلق قرآن تھا، "کَانَ خُلُقُہُ القُرآنَ" کسی کی ولایت کو ناپنا اور سمجھنا ہو تو آسان طریقہ یہ ہے کہ دیکھیں کہ وہ قرآن کریم کو کتنا شغف رکھتا ہے، اس کی بہتر سے بہتر انداز میں تلاوت کا اہتمام کتنا ہے، اس تناظر میں جب حضرت مولانا کو دیکھا جاتا ہے، تو آپ واضح طور پر ایک عاشق قرآن نظر آتے ہیں۔

علم تجوید و قرأت آج مدارس عربیہ کے منتظمین کی بے اعتنائیوں اور غفلت شعاریوں

کے نتیجے میں مظلوم ہو رہا ہے، الا ماشاء اللہ، اس علم اور اسکی اشاعت، اور مدارس میں اس کا کما حقہ نظام قائم کرنے سے بے اعتنائی کا سلسلہ ذاتِ خداوندی کی تعظیم میں کمی سے ملتا ہے، یہ بات خواہ کتنی ہی تلخ ہو مگر ہے صدفی صد حقیقت۔

قرآن کریم کے چار حقوق ہیں ۱۔ محبت ۲۔ عظمت ۳۔ تلاوت مع الصحت ۴۔ اطاعت۔

مدارس میں کما حقہ تلاوت مع الصحت کا نظام و انتظام نہ رکھنا، علم تجوید و قراءت کا شعبہ پوری اہمیت اور قوت کے ساتھ قائم نہ کرنا، درجات عربیہ اور علوم آلیہ کے اہتمام کے مقابلے میں اس اہم اور ضروری علم کو روا روی کا شکار بنا دینا یہ صحیح صورتِ حال ہے، ہر ادارے میں دیکھ جائیے، الا ماشاء اللہ۔

علم تجوید سے آپکا والہانہ شغف حضرت مولاناؒ کو خوش قسمتی سے علم تجوید و قراءت کے ولیٔ کامل، امام الفن اور قاری القرآن مولانا المقری فتح محمد صاحبؒ جیسے استاذ و شیخ ملے، اور اسی کے ساتھ آپکو محی السنہ قرآن کریم کو صحت اور عمدگی اور سنت کے مطابق پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں سراپا تحریک، مرشدی و مولائی حضرت مولانا ابرار الحق صاحب حقی ہردوئی دامت برکاتہم جیسی برکت العصر شخصیت سے عقیدت مندی نے آپکو اس علم کا ایک دردمند اور پرسوز محرک بنا دیا تھا، اُن مدارس میں جہاں علم تجوید و قراءت کا سرے سے انتظام نہیں، یا ہے مگر برائے نام ہے، انپر آپ بڑے رنج و قلق کا اظہار فرماتے تھے، آپ نے اپنے خون پسینے سے بنائے ہوئے جامعہ عربیہ ہتھورا میں ابتداء ہی سے تجوید و قراءت کے شعبے کا بہتر سے بہتر انتظام کی ہمیشہ کوشش کی، اور برابر فکر مند رہتے تھے، جہاں کہیں آپکو کوئی اچھا قاری مل جاتا اسے اپنے مدرسہ میں درس و تدریس کیلئے لیجانے کی خواہش و کوشش کرتے، اپنے

کے امتحانِ سالانہ کیلئے اچھے سے اچھے ممتحنین کو بلاتے، انکے جائزوں کے نتائج پر غور فرماتے مشوروں اور گذارشات پر توجہ دیتے، اسی طرح حضرت مولاناؒ کے زیر اثر اور زیر سرپرستی لاتعداد مدارس میں تجوید و قرأت کا انتظام نظر آئے گا،

کسی قاری کی خدمات علم وفن خواہ مشق وتمرین اور درس و تدریس کی شکل میں ہو، خواہ تصنیف وتالیف کی صورت میں آپ بڑی حوصلہ افزائی فرماتے، اس سے علمی وفنی گفتگو میں ایسا انہماک ہوتا کہ وقت کی رفتار بھول جاتے۔

ایک بار اکل کوا کے جلسہ سالانہ میں حضرت مولاناؒ کے بڑے مصروف نظام الاوقات تھے، انھیں میں بعد مغرب دور دراز سے آئے ہوئے لوگوں کو بیعت کرنے کا بھی نظام تھا، نماز مغرب کے معاً بعد حضرت مولاناؒ کی نگاہ اچانک راقم الحروف پر پڑگئی، بس پھر کیا تھا، اپنی جگہ سے چل کر راقم کے پاس آئے، اور پھر گفتگو اتنی طویل ہوگئی کہ بیعت کا نظام ختم ہی ہوگیا، اور عشاء کا وقت ہوگیا۔

انجمن خدام القرآن وانم باڑی مدراس جنوبی ہند کی ایک فعّال انجمن ہے، اس کے کارکن حضرات وقتاً فوقتاً علمی عنوانات پر مفید اجلاس منعقد کرتے رہتے ہیں ۲۹ ر ۳۰ رصفر ویکم ربیع الاوّل ۱۴۱۶ھ کو "سہ روزہ معلوماتی نظام برائے اساتذۂ حفظ وتجوید مدراس" کے عنوان سے ایک اجلاس منعقد ہوا تھا، اس سلسلے میں راقم الحروف کو بھی بلایا گیا، فاضلِ گرامی جناب مولانا محمد اقبال صاحب قاسمی نے راقم کو موضوع سے متعلق اظہار خیال کیلئے درج ذیل عنوانات کی جانب اشارہ فرمایا تھا۔

۱؎ حفظ کے ساتھ تجوید کی رعایت کس حد تک ضروری ہے ۲؎ بنیادی قواعد اور انکے سہل الحصول مآخذ ۳؎ حفاظ کیلئے قابل توجہ عام غلطیوں کی اصلاح

کا طریق کار (۴) قواعد کے اجراء اور مشق کی سہل صورتیں (۵) مدرسین شعبۂ حفظ کو تجوید کے سلسلے میں خصوصی ہدایات (۶) تجوید و قراءت، عہد نبوی ؐ کے قراء، ائمۂ قراءات (۷) مدارس عربیہ میں شعبۂ تجوید و قراءت کی ضرورت، اہمیت اور نظام (۸) نصاب کے سلسلے میں تجاویز اور ضروری ہدایات۔

راقم الحروف نے مذکورہ بالا عنوانات پر ایک تحریر مرتب کر لی تھی، حضرت مولانا ؒ اس اجلاس میں کسی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے تھے، مگر آپکو راقم کی تحریر اور اسکے مشتملات و مندرجات کی سرسری اطلاع ہو گئی تھی، راقم ابھی مدراس سے واپس دیوبند نہیں لوٹا تھا کہ یہاں حضرت مولانا ؒ کے فرستادہ جناب مولانا ...الدین صاحب آ چکے تھے، اور جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہ؛ خادم خاص حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب ؒ کو مقرر اور مامور کر کے چلے گئے کہ راقم جونہی واپس آئے، فوراً تحریر کے ساتھ باندہ بھیج دیا جائے، حضرت مولانا کا حکم، سفر کی تمامتر درماندگی اور تکان کے باوجود اگلے ہی روز باندہ پہونچا، حضرت ؒ نے اہتمام کے ساتھ پورے مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ کے سامنے بعد فجر بیس صفحات پر مشتمل وہ تحریر سنی اور سنوائی، اور ساتھ ہی فرمایا کہ اسے طبع کرا دو، ان شاء اللہ مفید ثابت ہو گی (وہ کتاب بنام "مقدمۂ علم قراءت، سفارشات و گذارشات" چھپی)

اِس علم کی تصنیفی خدمت

حضرت مولانا ؒ نے مختلف موضوعات اور اصناف علم پر مفید ترین اور گرانقدر تصانیف و تالیفات علمی کتب خانوں کو دی ہیں، انہیں ایک مختصر سا رسالہ "تسہیل التجوید" بھی ہے، یہ رسالہ بلا مبالغہ "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا مصداق ہے، بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہے، اور طلبۂ علم تجوید کیلئے سرمۂ بصیرت ہے۔

□□□

از:- مولانا حکیم محمد ساجد بستوی صاحب

سراپا میں جس جا نظر کیجئے
وہیں عمر اپنی بسر کیجئے

اس مختصر مضمون کی پیشانی پر جو شعر درج ہے وہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوانحی خاکے کی اجمالی ترجمانی اور حضرتؒ کی کثیر الجہات اور ہشت پہلو شخصیت کا حقیقی اظہار و بیان ہے۔ مزید شرح و توضیح کیلئے اگر بطور ایجاز صرف یہ کہدیا جائے کہ حضرت اقدسؒ اپنے گوناگوں اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ مبارکہ کے لحاظ سے صحیح معنیٰ میں آلِ رسولؐ اور نائبِ رسولؐ تھے تو یہ دونوں جملے درجۂ اجمال میں حضرت اقدس طاب ثراہ کی حیات و حالات کی عکاسی کیلئے بہت کافی ہیں۔ ذیل کی سطریں درحقیقت ان ہی دونوں خط کشیدہ جملوں کی تشریح ہیں، البتہ ہمارے لئے یہ بات نہایت اہم اور ضروری ہے کہ ہم حضرتؒ کی زندگی کے حالات صرف سوانحی حالات کی حیثیت سے نہ دیکھیں، بلکہ اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی

کوتاہیوں پر نظر ڈال کر عبرت اور سبق کے سامان تلاش بھی کریں۔

حضرت اقدس قاری صاحبؒ کوئی مافوق الفطرت شخص نہیں تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر اپنے فضل وکرمؐ سے کچھ ایسے اوصاف ودیعت فرمائے تھے جنکی بناء پر آپ اپنے ہمعصروں میں نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں، ان اوصاف سے میری مراد آپ کا بے پایاں اخلاص، ایثار، بلا امتیاز بنی نوعِ انسان کے ساتھ ہمدردی، اور آپ کی بے نفسی ہے۔ یہ اوصاف آپکی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں کارفرما نظر آتے ہیں، اسطرح آپ کا مخصوص طرز زندگی عقلاً ممکن العمل تو ہے مگر حد درجہ مشکل بھی ہے۔

حضرت اقدس قاری صاحبؒ اپنے نسب اور خاندان کے لحاظ سے آلِ رسولؐ تھے، تو اپنے بے شمار محاسن اور حیرت میں ڈال دینے والے کارناموں کے لحاظ سے سچے پکے نائبِ رسول بھی تھے۔ آپ مختلف شعبۂ زندگی میں غائر نظر ڈالیں تو آپ کو اسوۂ رسول اکرمؐ کی جھلکیاں قدم قدم پر محسوس ومشاہد ہونگی۔

حضرت قاری صاحبؒ کے ہمعصروں اور ہم زمانہ لوگوں میں نہ علماء کی کمی رہی ہے اور نہ مشائخ کی، اصلاحی کام کرنیوالے بھی خاصے رہے، مگر بلا تفصیل وموازنہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم مسلک مسلم طبقہ میں کیا، دوسرے مسلم طبقہ میں بھی ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی، جس کے پیروکاروں اور قدردانوں، بلکہ کہنا چاہئے کہ فدائیوں اور شیدائیوں کی اتنی بھاری تعداد رہی ہو۔ جبکہ حضرت قاری صاحبؒ کے عقیدتمندوں کا دائرہ دیگر اہلِ مسلک بلکہ برادرانِ وطن تک میں بہت وسیع تھا۔ علاقائی سطح پر برادرانِ وطن میں حضرت کی مقبولیت، اور ہر دلعزیزی قابلِ تعجب بھی تھی اور دیدنی بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ خلق خدا کے ساتھ بے لوث تعلق اور ایثار اور قبولِ عام میں ضرور ایک ربط ہے، حضرت قاری صاحبؒ جس طرح ہمہ وقت سب کیلئے سراپا ایثار اور خلوص بنے رہتے تھے، اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ

ت نے آپکو غیر معمولی اور ہمہ گیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی سے سرفراز بھی کیا تھا۔ ---

حضرت اقدس قاری صاحبؒ ایک عالم دین تھے، اور ایک بڑے ادارہ کے بانی ونتظم، اس ادارہ کو ادارہ تو آج کہا جا رہا ہے مگر بزرگوں اور درویشوں کی دوربینی وفرزانگی بھی نرالی ہوتی ہے، حضرتؒ نے اب سے لگ بھگ نصف صدی پہلے جب اس ادارہ کی بنیاد رکھی تھی تب ہی اس کا نام "جامعہ عربیہ" رکھا تھا، اور طرفہ یہ کہ نہ مقامی طور پر ترقی کے اسباب اور ذرائع تھے، اور نہ ہی بیرون وطن کوئی حلقہ تھا اسے حضرتؒ کے حوصلے کی بلندی، اور صرف توکل کی بنیاد پر کئے گئے عزائم کی رفعت اور درویشانہ پیش بینی کے سوا آپ اور کیا نام دیں گے؟ میری دانست میں ہندوستان کے متعدد صوبوں میں تنہا ایک شخص نے کسی بیرونی امداد وتعاون کے بغیر اتنا بڑا ادارہ نہ قائم کیا اور نہ ہی عرصہ تک چلایا ہوگا، بلاشبہ اتر پردیش میں بڑے بڑے ادارے ہمارے بزرگوں نے قائم کئے، جن سے انتساب پر ہم مسلمانوں کو بجا طور پر فخر ہے، اور وہ ادارے ہم ہندوستانی مسلمانوں کی اسلامی زیست کیلئے سرمایۂ حیات ہیں، مگر ان اداروں کے تاسیسی محرکات میں کسی خاص فکر یا ایک فکر سے وابستہ ایک منتخب جماعت کے اثرات کو تاریخی اعتبار سے ضرور تسلیم کرنا ہوگا۔

اداروں کے ارباب انتظام بالعموم اس غلط نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ تیزی سے تعمیرات اور درجات میں توسیع ہو، لیکن حضرت قاری صاحبؒ کا حال اس سے جداگانہ رہا ہے، عرصہ سے بیضاوی ومشکوٰۃ کے درجات تک کی تعلیم ہوتی رہی، اور فراغت کیلئے حضرتؒ کی خواہش اور رائے کے بموجب طلبہ "مظاہر علوم" سہارنپور اور "دارالعلوم" دیوبند جاتے رہے، اور ان طلبہ کے داخلے کیلئے کبھی کبھار حضرتؒ خود سہارنپور اور دیوبند کا سفر فرماتے کبھی یہیں

سے کوشش فرماتے، طلبہ کی بڑی تعداد کے باوجود دورۂ حدیث قائم کرنیکے لئے کبھی نہ سوچا مگر مخلصین نے ضرورت کا احساس اور اظہار کیا تو حضرت نے فوراً تسلیم نہ کر کے "مظاہر علوم" اور "دار العلوم" کے اکابر سے کوشش فرمائی کہ آپ حضرات دورۂ حدیث کے طلبہ کے داخلے کیلئے مقررہ کوٹہ میں توسیع فرمائیں، مگر طلبہ کی کثرت اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر ایسا نہ ہونے پر مجبوراً "جامعہ عربیہ" ہتھورا میں دورۂ حدیث کے قیام کا فیصلہ فرمایا۔ اسی ضمن میں حضرت کی ذرہ نوازی کا ایک واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو خود میرے ساتھ پیش آیا۔ حضرت نے مجھے ایک بار لکھوایا کہ "تم اپنی صوابدید سے میرے مدرسہ کیلئے دو استاذ حدیث طے کر دو" تنخواہوں کے بارے میں بھی مجھے ایک گونہ اختیار دیا گیا تھا، افسوس کہ قحط الرجال کے اس دور میں حضرت کی اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکا تھا۔

حضرت اقدس قاری صاحب نور اللہ مرقدہ کثیر الاسفار اور غیر معمولی ہجوم و مشاغل والے ایک شیخ طریقت بھی تھے، مگر وہ پیر نہیں جن کیلئے ہٹو بچو کی ان کے نیاز مند صدائیں لگاتے ہیں، اور گھنٹہ منٹ کی تفصیلات تک پروگرام سے جوڑے رکھتے ہیں، وعدہ کے ایفاء کا اہتمام تو حضرت میں خوب خوب تھا، مگر پہلے سے پروگرام نہ لئے ہوئے ضمنی لوگ بھی پوری طرح فیض اٹھا لیتے تھے، ایک بار "دار العلوم الاسلامیہ" تشریف آوری ہوئی، اور ضمنی پروگرام کے طور پر میرے غریب خانہ اور مدرسہ شرح العلوم کسونا تشریف لانے کا بھی نظم ہو گیا، میں تو بستی سے بغرض انتظام پہلے ہی نکل آیا، مگر حضرت کے میرے یہاں پہونچنے میں قدرے تاخیر ہوئی، معلوم ہوا کہ حضرت نے چلتے ہوئے فرمایا کہ "یہ کیا ضروری ہے کہ سب لوگ خود ہی مجھے ملنے آئیں، ایسا کرو کہ جو مدرسے سڑک کے پاس واقع ہوں، وہاں کے لوگوں سے ہم خود ہی ملتے چلیں" قربان جائیے اس سادگی اور بے نفسی پر۔

حضرت قاری صاحب برّد اللہ مضجعہٗ کے اندر ملّت اسلامیہ ہی کیا، بلکہ پوری نوعِ انسانیت کی فلاح و اصلاح کیلئے ایسا سوز اور ایسی تپش تھی کہ ہر آن بیقرار کئے رکھتی تھی، اسی وجہ سے حضرت کے اندر نہ کسل تھا، اور نہ ہی ایسا تعب و تکان جو حضرت کے بلند ارادوں اور حوصلوں میں ذرا بھی اضمحلال پیدا کر سکے۔

حضرت اقدس قاری صاحبؒ اپنے وعظ و تقریر کے پروگراموں کی کثرت کے لحاظ سے ایک فدائے قوم و ملت شخص تھے، مگر مشّاق پیشہ ور اور زبر گو خطیب و مقرر قطعاً نہ تھے، آپ کا بیان موقع کی مناسبت سے ہوتا تھا گویا کہ ملت کی دکھتی رگ پکڑ لی ہو، ایک کامیاب طبیب حاذق کی طرح نسخہ مجرّب اور مختصر ہوتا، مگر اس میں علاج کی تفصیل اور پرہیز کی تمام ضروری ہدایات موجود ہوتیں، حضرت کا بیان سوزِ دروں اور حمیّت دینی کا پوری طرح عکاس ہوتا، ایک بار "دارالعلوم الاسلامیہ" کی مسجد میں فرمایا کہ "آج ہماری حالت یہ ہے کہ اگر گھر کی ایک مرغی شام ہوتے ہی گھر نہ پہونچ جائے تو گھر کا ہر فرد پریشان ہو جاتا ہے، کوئی اِدھر تلاش کیلئے نکلتا ہے کوئی اُدھر مگر ہماری بالغ اولاد آدھی رات تک گھر نہ آئے تو نہ باپ کو اسکی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی ماں کو۔

حضرت قاری صاحبؒ مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے کبھی کبھار بہت ہی لطیف مزاح بھی فرماتے، ایک بار شرح العلوم کسونا کے زیر انتظام منعقد ایک اجلاس میں حضرت مدعو تھے، اسی موقع پر میری بڑی لڑکی کا عقد بھی تھا، عصر سے ذرا پہلے، حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا عبد القیوم صاحب مدظلہ کے ساتھ کار پر حضرت تشریف لائے۔ کار میرے مکان کے سامنے رکی، میں نے لپک کر درخواست کی کہ حضرت پانی پی لیں، مسکرا کر فرمایا کہ پانی پورپی پلائیں گے یا پچھمی، میں نے عرض کیا کہ حضرت انتظام تو ہر طرح کا ہے۔

ایک بار مدرسہ "اظہر العلوم" امرڈوبھا میں حضرت تشریف لائے۔ کھانے کا نظم پڑوس میں ایک مخلص کے یہاں تھا، کھانے کیلئے نشست دو رویہ تھی، حضرت کے بائیں سمت میں دروازہ تھا، اسی دروازے سے کھانا لایا جا رہا تھا، ایک صاحب روٹیاں ایک پلیٹ میں رکھ کر ایک دوسرے شخص کو پکڑا رہے تھے، کچھ عجلت اور کچھ غفلت میں روٹی کی پلیٹ حضرت کے سر سے لگ کر گرتے گرتے بچی، حضرت نے مسکرا کر فرمایا کہ بھائی سالن کی پلیٹ دوسری طرف سے لے آنا، سب ہی حاضرین زیر لب مسکرانے لگے۔

ایک بار مئو ر ا میں حضرت کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا، حضرت غالباً سبق کی تیاری میں جلدی جلدی سب کو نمٹا رہے تھے، ایک نوجوان نواحِ لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے، اپنا بریف کیس حضرت کے کمرہ کے سامنے برآمدہ میں رکھ کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری ماں اور فلاں فلاں کے لئے تعویذ چاہئے، تعویذ لکھ کر حضرت نے عنایت فرمایا، ان تعویذوں کو رکھ کر نوجوان نے آ کر پھر کسی کیلئے تعویذ لئے، تھوڑی ہی دیر میں پھر آ کر کہا کہ حضرت فلاں پر جن کا اثر ہے، اس کیلئے بھی دیدیں۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ بھائی اس پر جن کا اثر ہو نہ ہو، تم پر تو ضرور ہے، پہلے تم اپنے لئے ہی لے لو، میں مزاج و طبیعت سے ذرا ہنسوڑ واقع ہوا ہوں، بے ساختہ ہنسی آ گئی، حضرت بھی خوب مسکرائے۔

مجھ کور باطن کو یہ تو نہیں معلوم ہے کہ سلوک و طریقت میں کیا کیا مقامات آتے ہیں، اور اہل اللہ کب کس مقام پر فائز ہوتے ہیں، تاہم اپنے مشاہدات کی روشنی میں حضرت قاری صاحبؒ کی صفائی باطن اور کشف و کرامت کا

قائل ہوں۔ میں ہر چند کہ طبعاً زود منفعل نہیں ہوں، تاہم ایسے متعدد واقعات میرے سامنے ہیں جنکو میں بجز کشف و کرامت اور صفائی باطن کوئی اور نام نہیں دے سکتا۔

ایک بار حضرت مولانا عبد القیوم صاحب مدظلہ کے یہاں مدرسے کا سالانہ جلسہ تھا حضرت کو صبح میرے گاؤں۔ ڈنور دبر۔ سے ہوتے ہوئے گورکھپور تشریف لیجانا تھا، نصف شب کے لگ بھگ حضرت "دار العلوم الاسلامیہ" تشریف لے گئے ہم سب بھی پہونچے، حضرت نے فرمایا کہ مجھ کو اتنے بجے جگا دینا، حضرت جنوبی عمارت میں نیچے کی منزل کے زینے سے متصل والے حجرہ میں آرام فرمارہے تھے، مولانا نثار احمد صاحب مدظلہ، مولانا عبد الحفیظ رحمانی صاحب مدظلہ اور راقم سطور ایک دو کمرہ کے بعد والے کمرے میں تھے، ہم لوگوں نے یہ سوچ کر کہ اب رات کے صرف چند گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ سوئیں اور وقت پر بیدار نہ ہوسکیں اسلئے ہم لوگوں نے جاگتے ہی رہنے کا فیصلہ کیا، حضرت کے بتائے ہوئے وقت پر بیدار کرنیکے لئے کمرے کی طرف بڑھے تو ذکر۔ اللہ، اللہ۔ کی آواز سنائی پڑی حضرت کو دیکھا تو وہ سورہے ہیں، میں لپکا ہوا اپنے کمرے میں آیا، اور ان دونوں صاحبان کو بھی بتایا، یہ دونوں حضرات آئے اور سب نے ذکر بالجہر کی آواز سنی، اس کے بعد حضرت کو بیدار کیا گیا، اور وضو کرایا گیا، پھر حضرت اپنے معمولات میں لگ گئے۔

غالباً اسی موقع پر یا کسی اور موقع پر حضرت "محمد انشاہی" میں تشریف فرما تھے بعد نماز عصر ایک صاحب کے یہاں جانے کا نظم تھا، شاید مولانا ابرار احمد صاحب یا مولانا نثار احمد صاحب کے ہمراہ حضرت کے پیچھے چلنے والی بھیڑ کیساتھ میں بھی چلتا رہا، مگر مجھے چلنے کے وقت ہی سے یہ بات اندر اندر کھٹک رہی تھی کہ حضرت

کے ساتھ طفیلیوں کے اس ٹڈی دل کی اس پروگرام میں شرکت مناسب ہے یا نہیں
پھر آگے ہوا یہ کہ میزبان کے یہاں لمبے کشادہ فرش پر بیٹھنے میں میری مواجہت
حضرت قاری صاحب سے ہو گئی، اور میری یہ حالت تھی کہ میں اپنے اسی خیال میں
ڈوبا ہوا تھا، یکایک حضرت نے فرمایا کہ حکیم صاحب کھائیے! ہر جگہ خودداری
اچھی نہیں ہوتی۔ میں تو حیرت و استعجاب کے ساتھ ندامت میں ڈوب گیا۔

ایک بار حضرت بستی کے مختلف دیہی علاقوں کے پروگرام پر تشریف لائے،
دوپہر کے کھانے کا نظم میرے غریب خانہ پر تھا، حضرت نے کپڑوں کے تبدیل
فرمانے اور غسل کی خواہش ظاہر فرمائی، میرے بھائیوں نے کپڑے دُھلے اور
حضرت نے میرے مکان کے پیچھے کی چار دیواری میں غسل فرمایا، چار دیواری
پرانے طرز کی مٹی سے بنی ہوئی تھی، جسکا بیشتر حصہ گذری ہوئی برسات میں نیچا ہو
ہو گیا تھا، اور ان حصوں پر ٹاٹ اور مونجھ کی ٹٹیوں سے پردہ کیا ہوا تھا۔
حضرت یہاں سے تشریف لے جاتے ہوئے متعدد پروگراموں میں شرکت فرماتے
ہوئے متھورا پہونچے، اور دل کی تکالیف کی تشویشناک علالت پیش آئی، میں
حضرت کی مزاج پرسی کیلئے متھورا اسوقت پہونچا جبکہ حضرت کو کانپور اسپتال
سے واپس متھورا لایا گیا تھا، مرض کی نزاکت اور حضرت اقدس کی راحت کی
خاطر دو، دو، چار، چار لوگوں کو زیارت اور صرف سلام کرنے کی اجازت دی
جا رہی تھی، حضرت کے معتمدِ خاص محترم مفتی عبید اللہ الاسعدی کی طرف سے
یہ ہدایت تھی کہ حضرت سے بات نہ کریں، میں بھی ایک مختصر ٹولی میں شامل تھا
حاضر ہوا اور سلام کیا، حضرت نے میری بیمار اہلیہ کی خیریت پوچھی، اور فرمایا کہ
تم نے اپنے مکان کے پیچھے چار دیواری بنوائی یا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت ابھی
تو نہیں بنی ہے بننے میں کچھ دشواری ہے، حضرت سے دعا کی درخواست ہے

غالباً اسی وقت حضرت نے کچھ دعائیہ کلمات کہے۔ بننے میں دشواری سے میری مراد یہ تھی۔ کہ میرا مکان بشمول راقم زمینداروں کی مشترکہ زمین میں واقع ہے جسکے بیشتر شرکاء برادرانِ وطن ہیں، ان ہی کی طرف سے مجھے مزاحمت کا اندیشہ تھا، مگر چند روز کے بعد ہوا یہ کہ قریبی پولیس اسٹیشن کا ایک پولیس انچارج میرے پاس بغرضِ علاج آیا جو "زحیرِ مزمن" کا مریض تھا، میں اسکو دوائیں اس انداز سے دیتا رہا کہ وہ ایک دو دن کے ناغہ سے کافی دنوں تک میرے پاس آتا رہا، میں اپنی اس حکمتِ عملی سے دیکھنے والوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ کچھ بات ہے کہ داروغہ آئے دن یہاں آتا رہتا ہے، اس طرح چند دنوں کے بعد مزاحمت کا خطرہ مجھے ٹلتا ہوا محسوس ہوا، اور میں نے ایک منصوبے کے تحت آناً فاناً چار دیواری کا کام مکمل کرالیا، میں صورتِ واقعہ اور نوعیتِ کار کی سہولت کو حضرت اقدس کی دُعا اور توجہ ہی کا نتیجہ باور کرتا ہوں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی پوری امت اسلامیہ کیلئے ایک سبق ہے۔ آپ گفتار کے غازی قطعاً نہ تھے، آپ کی زندگی نظری سے زیادہ مکمل طور پر عملی تھی۔

ملت اسلامیہ کے افق پر نیر تاباں بنکر اپنی ضوفشانیوں سے عالم کو منور کرنیوالی بے شمار شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں علم و عمل، تقویٰ و طہارت اور تدبر و فراست مومنانہ کے ذریعے قوم و ملت کی یادگار خدمات انجام دے کر دنیائے فانی سے رخت سفر باندھ لیا، اور پھر دنیا کیلئے ان کا بدل یا ان کی نظیر پیش کرنا مشکل ہو گیا۔ یہ قانون قدرت ہے کہ جس نے اس عالم رنگ و بو میں قدم رکھا، وہ نوشتۂ قضا و قدر سے باہر اور آزاد نہیں رہا، اسے ایک نہ ایک دن دست اجل سے مجبور کر دنیا چھوڑ کر سپرد خاک ہونا ہے "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" (ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے)۔

اور ابھی سال گذشتہ ۱۹۹۷ئہ ہی میں دنیائے اسلام کی دو عظیم شخصیتوں (حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالنپوریؒ۔ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ) کی جدائی کا زخم لوگوں کے دلوں میں تازہ ہی تھا کہ سیدی و مخدومی حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً بھی داغ مفارقت

دے گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔

اے حبیب ہر طبیب و ہر علیل
گشت درد عاشقاں صبر جمیل (جامیؒ)

ربِ قدیر خالقِ کون و مکاں کا یہ کرشمۂ قدرت ہے کہ دنیا قائم کرنے سے لیکر اب تک اپنے بھٹکے ہوئے اور پریشان بندوں کی ہدایت و رہبری کیلئے اپنے باکمال و ہر نوع جامع الصفات منتخب بندوں کو ہدایت و رہنمائی علم و حلم، زہد و تقویٰ رافت و رحمت اور اخلاص و للٰہیت کا مجسمہ بنا کر بھیجتے رہے ہیں، چودہ سو سال پیشتر اس برگزیدہ گروہ کا اصطلاحی نام انبیاء کرام اور پیغمبرانِ دین تھا جن کی زندگی کا ہر گوشہ بعد والوں کیلئے اسوۂ حیات ہوا کرتا تھا۔ خاتم النبیین حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسالت کا یہ سلسلہ ختم ہوا، تو اسی مقصد مذکور کی تکمیل کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی امت میں سے علماء ربانیین کا انتخاب ہوا جیسا کہ ارشاد نبوی ہے، اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ (علماء دین انبیاء کے وارث ہیں) اور ارشادِ ربانی ہے: وَاَوْرَثْنَا الْکِتَابَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا الآیۃ (پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچائی جنکو ہم نے اپنے بندوں میں پسند فرمایا) ایسے علماء ربانیین درحقیقت پیغمبرانہ عزائم اور داعیانہ جذبات سے سرشار ہوتے ہیں، جو نفس کے تقاضوں اور خواہشات سے بھری اور تیرہ و تار دنیا سے بالاتر ہوتے ہیں انسانی طبقے کے ہر فرد سے سچی ہمدردی اور مخلصانہ لگاؤ رکھتے ہیں، کسی کی بے راہ روی دیکھ کر تڑپ اٹھنا، کسی کی مصیبت دیکھ کر بے چین و مضطرب ہو جانا، کسی کی جہالت و خود رائی کو دیکھ کر رو پڑنا، کسی مظلوم کی دادرسی میں خود ہی ظلم و ستم کا ہدف بن جانا، غریبوں، بیکسوں، بیواؤں اور یتیموں کیلئے اپنی راحت کا خیال ہی نہ کرنا بلکہ ان کیلئے ہر مصیبت کو جھیلنا، اور ہر تکلیف گوارا کرنے میں لذت محسوس کرنا،

اور امّت کی ہر مشکل کو حل کرنے کیلئے شب و روز کے ہر لمحے میں اپنے کو بے لوث ہو کر مشغول کر دینا ان کا کام ہوتا ہے، یہی وہ اللہ کے مخصوص و برگزیدہ بندے ہوتے ہیں جن سے رسولِ امی (فداہ ابی وامّی) صلی اللہ علیہ وسلم کی صفاتِ جہاں آرا کا انعکاس ہوتا ہے، قرآن ناطق ہے: عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (تمہاری پریشانی ان پر شاق ہے، تمہاری بھلائی کے دل و جان سے خواہاں ہیں، مومنین کے ساتھ بیحد مہربان اور رحم والے ہیں)

؎ خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے

ماں باپ کو اپنی عزیز ترین اولاد اور لختِ جگر کے ساتھ جو رافت و رحمت شفقت و مروت اور ہمدردی و غمخواری کا تعلق ہوتا ہے، اور ان کے لئے ایامِ رضاعت سے جوان ہونے تک جن جن تکالیف اور صعوبتوں کو سردی و گرمی سے بے نیاز ہو کر جھیلنے میں لذت محسوس کرتے ہیں، ان اللہ کے مخلص و برگزیدہ بندوں کو اللہ کی مخلوق سے اس سے کہیں زیادہ تعلق و لگاؤ ہوتا ہے۔ ان حضرات کی زندگی کتاب و سنت اور اسوۂ رسول کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت کی وجہ سے تمام پیغمبرانہ خوبیوں کا عکسِ جمیل ان کی زندگی کو روشن کر دیتا ہے۔

امّت کے ہر فرد کیلئے وہ اپنے جسم و جان سے ہمہ وقت حاضر رہتے ہیں بلکہ انکی کریم النفسی اہلِ ایمان سے متجاوز ہو کر غیر مسلموں تک بھی پہونچتی ہے۔ انکا مقصد صرف اور صرف رضائے الٰہی ہوتا ہے، انکی نظر میں امیر و غریب، وزیر و فقیر، شاہ و گدا، شہری اور دیہاتی سب برابر ہوتے ہیں، اور وہ ہر ایک کے حسبِ حال اصلاح و امداد سے کسی طرح دریغ نہیں کرتے۔

یہ اللہ کے وہ محبوب ترین بندے ہیں جنکی محبوبیت و مقبولیت عرشِ اعظم سے زمین پر اتار دی جاتی ہے، یہ حزب اللہ ہیں، یہی اولیاء اللہ ہیں۔ دنیا کی ہر چیز ان سے محبت کرتی ہے، انکو دیکھ کر دلوں کو سکون ملتا ہے۔ ارشادِ باری ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ۹۶) (البتہ جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کئے ارحمٰن انکو محبت و محبوبیت سے نوازیں گے)

ذاتی سرگذشت اور آپ بیتی یا سوانح و تذکرہ کسی کا بھی ہو دلچسپ ہوتا ہے، چہ جائیکہ ایسے بزرگوں کے حالات جو فنائیت کے پتلے تسلیم و رضا کے بندے اور محبت و محبوبیت کے مجسمے، دلآویزی ان کی حکایات و واقعات میں نہ ملے گی تو کہاں ملے گی۔

سیّدی و مخدومی حضرت مولانا حافظ قاری سیّد صدیق احمد باندوی صاحبؒ بھی انھیں برگزیدہ مقبول انسانوں میں سے تھے جنکی مقبولیت و محبوبیت زمین پر اتار دی گئی تھی، وہ ولی کامل، عالم ربانی اور بے شمار ایسی خوبیوں کے جامع تھے، جو اگر انسانی گروہ پر تقسیم کر دی جائیں تو اولیائے مقبولین کی ایک جماعت بن جائے، اسی لئے ہر شخص آپ سے محبت کرتا تھا اور اب آپکی جدائی سے تڑپ رہا ہے، آپ کی ذاتِ گرامی ہر ایک کو علمی، عملی، انتظامی اور سماجی مشکلات میں رہ رہ کر یاد آتی رہے گی ؎

ہر کراز جوہر زباں درماندہ شد ❊ رخت بست و در دلسو با ندہ شد
آہ آں دستِ مسیح و آں دعا ❊ از کجا باز آورند اہل النہیٰ

حضرت قاری صاحبؒ کا سراپا، اور آپکی عملی زندگی کے طور طریق، سادگی اور جفاکشی دیکھ کر صحابہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی کہ وہ مقدس ہستیاں ایسی ہی رہی ہونگی، جنکو ایک نظر دیکھ لینے سے دل کی دنیا میں خوفِ خدا، فکرِ آخرت، اور

رضائے الٰہی کی موجیں اٹھنے لگتی تھیں، اور آن کی آن میں ایک بگڑا ہوا انسان معرفتِ الٰہی کے سمندر میں ڈوب جاتا تھا۔ ـــــ

حضرت والا اخلاص وللہیت اور فنائیت کے اس اعلیٰ مقام پر ہوتے ہوئے بھی دل سے اپنے آپکو سب سے کمتر سمجھتے تھے اسی وجہ سے اللہ رب العزت نے آپکو سب سے برتر کر دیا "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ" (جو اللہ کیلئے اپنے کو کمتر سمجھتا ہے، اللہ اسے برتر کر دیتا ہے)

جامعیت اور آپ کی جامعیت و مرکزیت کا راز بھی اسی سے منکشف ہو جاتا ہے چنانچہ آپ کی ذاتِ عالی صفات (بحیثیتِ عالم ربانی علماء کے لئے بحیثیت حافظ و قاری حفاظ و قراء کیلئے، بحیثیت باکمال ماہر درسیات درس دینے والے اساتذہ و مدرسین کیلئے، بحیثیت منتظم و مدبر اہل انتظام و اہل تدبیر کیلئے بحیثیت داعی عوام و خواص کیلئے، بحیثیت پیر و مرشد اہل سلوک و اہل باطن کیلئے، بحیثیت ولی کامل ساری کائنات کیلئے، بحیثیت سچے مخلص مشیر اہل الرائے و اہل استشارہ کیلئے، بحیثیت صحیح الفکر و عالی دماغ انسان متنازع فیہ امور میں فریقین کیلئے بحیثیت مخلص و ہمدرد تمام اپنے پرائے کیلئے، بحیثیت میزبان ہر وارد و صادر کیلئے، بحیثیت ہادی و پیشوا تمام قائدین اور رہنماؤں کیلئے) مرکز توجہ بن گئی تھی، اور سبھی کے قلبی لگاؤ کا محور تھی، ہر شخص اور ہر طبقے کو اپنے تمام نجی اور ذاتی اختلاف سے بالاتر ہو کر آپ سے ایسا قلبی لگاؤ رہا کہ ماضی قریب کی تاریخ میں کسی جامع ترین شخصیت میں وہ بات نظر نہیں آتی۔

؎ حسن ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے ملحد باخبر بھی گم جلوۂ لاالٰہ میں

؎ أَفْضَلُ النَّاسِ مَا بَیْنَ الْوَرٰی رَجُلٌ
تُقْضٰی عَلٰی یَدِہٖ لِلنَّاسِ حَاجَاتٌ

چنانچہ آپکی جامعیت و مرکزیت اور مرجعیت کا ایک عام مشاہدہ "جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ" میں، اور اس کے علاوہ ملک و بیرونِ ملک آپ کے اسفار میں برابر ہوتا رہتا تھا، حضرت کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ کیسے ہیں؟ ہر ایک کی نگاہیں حضرت ہی پر ہیں، حضرت ہی کو دیکھ رہی ہیں، ایسے میں جس کو حضرت نے بلا لیا گفتگو کا موقع مل گیا، یا حضرت کے روبرو سامنا ہوگیا وہ جتنا فخر و ناز کرے کم ہے، حضرت ہیں کہ فرداً فرداً سبھی کی سن رہے ہیں، جواب دے رہے ہیں، مسائل کا حل فرما رہے ہیں، کسی بھی آنیوالے کو محروم و مایوس کر دینے کا سوال ہی نہیں، گویا زمانے کے ستائے ہوئے لوگوں کیلئے ایک ہی پناہ گاہ تھی، جہاں ہر ایک کو بقدر نصیب سکون و اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

ایک ہزار صدی پہلے کا انسان

حضرت والا کے اندر قادر مطلق نے اپنی کریمی سے ایسے اوصاف و کمالات ودیعت کئے تھے جس نے آپکو قدمائے سلف کی فہرست میں شامل کر دیا تھا، آپکو دیکھ کر قدماء کی سوانح و تذکرے سے واقف کار انسان بیساختہ کہہ اٹھتا تھا کہ "آپ اپنے اخلاق عالیہ اور بلند ہمتی، مومنانہ فراست، قوتِ حافظہ، ذوقِ عبادت، تقویٰ و طہارت، توجہ الی اللہ، تضرع و انابت، علوم نادرہ، اعمالِ صالحہ، اور شب و روز کے بے تکان مجاہدہ کی وجہ سے موجودہ دور (چودھویں صدی) کے انسان نہیں ہیں، بلکہ کم از کم ایک ہزار صدی پہلے کے انسان ہیں، جنکو دیکھ کر زندگی کی تعمیر ہوتی تھی، طہارت و تزکیۂ اعمال کی روح بیدار ہوتی تھی، صبر و شکر، انابت و عبدیت اور قرب و رضائے الٰہی کا صحیح مقام حاصل ہوتا تھا۔

دین اسلام کے اصل مزاج سے آشنا

سیدی و مخدومی دین اور دینی دعوت کے اصل مزاج اور اس کے

آثار و نتائج سے کامل واقف کار، علم و عمل کے ذوق سے بہرہ ور، اور قرآن و حدیث کے اصول و فروع سے آشنا تھے، اسی لئے عوام و خواص کا ہر طبقہ ہندوستان کے چپہ چپہ سے آپ کے طور و طریق اور شب و روز کی مصروفیات و مجاہدہ اور اعمال کو دیکھنے کیلئے جاتا تھا، اور آپکی زیارت کو اپنی سعادت اور آپ کیساتھ گذرے وقت کو سرمایۂ حیات باور کرتا تھا،

اللہ والوں سے ملنا اور ملتے رہنا، اور انکی پاکیزہ صحبتوں اور مستجاب دعاؤں میں شریک ہونا، زندگی کے سدھارنے اور دلوں کی دنیا تعمیر کرنے میں ممدّ و معاون ہوا کرتا ہے، اس لئے راقم سطور کے احباب کا ایک خاص حلقہ تھا جو ہر سال رمضان کے اخیر عشرہ میں دو تین دن کیلئے باندہ کا سفر کرتا تھا، اور حسب حال فیضیاب ہوتا تھا، اور باندہ سے واپسی کے بعد سکون و اطمینان اور ایمانی کیفیات میں کافی قوت محسوس کرتا تھا،

حضرت والا دینی امور کیلئے سراپا سفر تھے، اور آخری سالوں میں تو اس کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا، یہ حضرت والا کی کرامت ہی تھی کہ اس کے باوجود جامعہ ہتھورا میں پڑھائی جانے والی، حدیث، معانی، نحو، منطق کی اہم کتابوں کے درس کی بھی تکمیل کراتے تھے۔

دارالعلوم الاسلامیہ بستی بھی حضرت والا کی اصلاحی کوششوں کی ایک کڑی ہے، اس کی سرپرستی اور فکر حضرتؒ آخری دم تک فرماتے رہے، اور اس سلسلے میں بار بار بستی آنا ہوا، اور جب بھی حضرت تشریف لائے، بستی کے مختلف مدارس میں تشریف لے گئے جنکو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا، حضرت جہاں بھی گئے کام کیلئے گئے، اور جہاں بھی رکے کام کیلئے رکے، آرام کیلئے کہیں نہیں رکے، راقم سطور کے احباب کے درمیان ایک طے شدہ بات تھی کہ حضرت

کا کوئی پروگرام چھوٹنے نہ پائے، چنانچہ اس سلسلے کی سیکڑوں یادگار باتیں ہیں جنکو قلمبند کرنے کیلئے دفتر چاہیئے، پھر بھی ان دعوتی اسفار، قیام وطعام، سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے، اور دیگر مصروفیات وتقریری پروگراموں میں حضرت والا رحمہ اللہ کے اندر ایک خاص بات نمایاں طور پر دیکھی گئی کہ رب ذوالجلال کے دربار کی حاضری کا منظر آپکے قلب ودماغ پر اسقدر مستحضر تھا کہ امت کی اصلاح کی راہ میں جسم وجان دل ودماغ کی پوری قوت صرف کردیتے تھے۔ عقائد باطلہ کی تردید، رسوم جاہلیت کا ابطال، حرام ذرائع آمدنی کے نقصانات کی وضاحت اخلاقی بگاڑ کی اصلاح، اور معاشرے کے فساد کا انسداد پوری قوت سے فرماتے اور اسکو دلنشیں ومؤثر مثالوں سے اس طرح واضح فرماتے کہ اگر طبیعت میں عناد نہ ہو تو آدمی تائب ہوجائے، اور آئندہ کیلئے اچھا انسان بن جائے۔

رب کریم ہم سب کو حضرت والا کے نقش قدم پر چلا کر اپنی رضا سے نوازے اور حضرت کے صالح آثار جو مدارس، مکاتب، مساجد، تصانیف اور اصلاحات کی شکل میں ہیں، ان کو قائم وباقی رکھنے کی ہمت وتوفیق عطا فرمائے۔

آمین یارب العالمین

از —— مولانا محمد عزیز اختر قاسمی
استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

نمونۂ اسلاف حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ پر لکھتے ہوئے دل ایک طرف درد والم اور رنج وغم سے دوچار ہو رہا ہے، تو دوسری طرف ایک مخلص و مقبول بندۂ خدا پر لکھنے کی سعادت سے تھوڑی تسکین ہو جاری ہے کہ شاید یہی سطریں سعادتِ دارین کا سامان بن جائیں۔

ے حکایت از قدِ آں یارِ دل نواز کنیم
باین بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

حضرت قاری صاحب طاب اللہ ثراہ ایک باکمال مدرس، عمدہ قاری سنت نبوی کے پیکر، تصنیف وتالیف کے امام، خانقاہوں کی آبرو، انسانیت کے مسیحا اور اخلاص وللہیت کا مجسمہ تھے، جن کے دم سے خانقاہیں بارونق مدارس آباد، اور عالمان دین ربانی کا بھرم قائم تھا، آپ ملت اسلامیہ کے پاسبان، اور امت مسلمہ کے روحانی پیشوا تھے۔

؎ آپ ہی کی ذات اقدس تھی کہ جس کے فیض سے
عالمانِ دینِ ربانی کا قائم تھا بھرم

ان اوصاف حمیدہ کے علاوہ آپ میں ایک ایسا وصف تھا جس میں آپ منفرد مقام رکھتے تھے، آپ کا مقام مقام محبوبیت تھا، ہر شخص ایک ملاقات میں گرویدہ اور ایک نظر میں عاشق زار ہو جاتا تھا، اخلاص وعمل کے اس پیکر محسوس کو دیکھ کر خدا یاد آتا اور ایمان وعمل کے بجھتے ہوئے شعلوں میں حرارت پیدا ہو جاتی تھی، عوام وخواص کی وارفتگی ووابستگی کا عالم قابلِ دید ہوتا، آپ جہاں پہونچتے مخلوق خدا کی ایک بھیڑ لگ جاتی، ہر شخص کی نگاہیں ایمان واحتساب کے اس مجسمہ کو دیکھنے کے لئے بیقرار رہتیں، صرف ایک مصافحہ، ایک ملاقات کیلئے لوگ دور دراز کا سفر کرتے اور آپ کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے تھے۔

حضرت والا کا حال بھی مخلوقِ خدا کیلئے ماہیٔ بے آب سا ہوتا، ہر ایک کے کام آنا، ہر شخص کی پریشانیوں مصیبتوں اور تکلیفوں پر تڑپ جانا اور اس کا مداوا کرنا آپ کا وصفِ خاص تھا، چھوٹے، بڑے، امیر، غریب، عالم، جاہل شہری، دیہاتی، ہندو مسلمان ہر ایک کا دکھڑا سننا، اور حتی المقدور اس کا تعاون کرنا، دامے درمے قدمے سخنے مدد کرنا، معمولی سی بیماری کی اطلاع پاکر عیادت کیلئے جانا آپ کی زندگی کے عام واقعات تھے، امت مسلمہ کے کسی فرد بشر یا شعائر اسلام کو ذرہ برابر زک پہونچتی تو آپ اس کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے اور اَلْمُسْلِمُوْنَ كَجَسَدٍ وَاحِدٍ اِذَا اشْتَكٰى عَيْنُهٗ اِشْتَكٰى كُلُّهٗ کی عملی تصویر نظر آتے تھے۔

؎ خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

حضرت قاری صاحبؒ کو مخلوق خدا کو راحت پہونچانے، اور ان کے کام آنے کی بیحد فکر رہتی جس کیلئے بڑی سے بڑی پریشانیاں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیں، عوام و خواص کیلئے اپنا راحت و آرام تج دیا، نہ بیماری کی پرواکی، اور نہ سفر کی دشواریوں کا خیال کیا، مدارس کے جلسوں کے زمانے میں ایک ایک رات میں کئی کئی جگہ بیان کرتے، تقریریں فرماتے، بیعت و ارشاد کرتے اور عوام کے تعویذ بھی لکھتے کتنے ہی جھگڑوں کا تصفیہ کرتے، اور دو متحارب گروہوں میں صلح کا فریضہ بھی انجام دیتے، بارہا ان آنکھوں نے دیکھا کہ حضرت تھک کر چور ہو جاتے نڈھال ہو کر لیٹ جاتے، جیپ اور کار میں سہارا دیکر چڑھایا جاتا، اور اسی میں محو خواب ہو جاتے، اور دوسری جگہ پروگرام کے وقت تک ایک عجیب قوت خداداد سے اٹھتے پھر اسی طرح مخلوق خدا کے کام میں منہمک و مشغول نظر آتے ایسا لگتا کہ کچھ ہوا ہی نہ تھا، تدریس کیلئے بیٹھتے تو علوم و حقائق کے چشمے بہاتے تقریر کرتے تو اصلاح عوام و خواص کیلئے دل و جگر پیش کرتے، یہی سب کچھ روز و شب کا معمول اور زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

سہ ہمارا شغل ہے دن رات رونا یادِ دلبر میں
ہماری نیند ہے محوِ خیالِ یار ہو جانا!

حضرت والا کو محبوبیت کا جو خاص مقام بارگاہِ رب صمد کیطرف سے ملا تھا اس کا ذکر مسلم شریف کی حدیث میں ہے: عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰہَ اذا اَحَبَّ عَبْدًا دعا جبرئیلَ فقال اِنی اُحِبُّ فُلَانًا فاحِبَّہٗ قَالَ فیحبّہ جبرئیل ثم یُنَادِیْ فی السَّمَاءِ فیقولُ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ فُلَانًا فاحبُّوہ فیحبُّہٗ اھلُ السَّمَاءِ ثم یُوضَعُ لہ القبُولُ فِی الارضِ (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللّٰہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیلؑ کو بلا کر فرماتے ہیں کہ مجھے فلاں بندہ محبوب ہے تم بھی اس سے محبت کرو! حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جبرئیلؑ اس بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر آسمانوں میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو فلاں بندہ محبوب ہے، لہذا سب لوگ اس سے محبت کریں، اب آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر زمین میں اسکی مقبولیت اتار دی جاتی ہے (اور زمین والے بھی اس کے عاشق زار ہو جاتے ہیں)۔

راقم الحروف کو حضرت والا سے تلمذ کا موقع میسر آیا اور نہ ہی اصلاحی تعلق نصیب ہو سکا، اس حرماں نصیبی اور بدقسمتی پر جسقدر آنسو بہائے جائیں کم ہے البتہ حضرت والا کا دارالعلوم الاسلامیہ سے والہانہ تعلق تھا، حضرت مدرسہ ہٰذا کے خصوصی سرپرست اور اسکے قیام کے محرک اوّل تھے، ابتدائے قیام سے تا وفات سرپرستی فرمائی، اور ہر مشکل کے وقت ہر طرح کا تعاون فرمایا۔

میری طالب علمی کا زمانہ تھا، غالباً ۱۹۸۳ء کا سال تھا حضرت مدرسہ میں تشریف لائے، غائبانہ تعلق پہلے سے نام سن کر ہی ہو چکا تھا، اب صورت دیکھی میانہ قد موٹی گردن، نورانی چہرہ، بارونق اور رجاہ وجلال سے بھرپور، آنکھیں شراب معرفت سے سرخ، تو ہزار دل وجان سے قربان ہونے لگا، اور عجیب روحانی ومعنوی تعلق پیدا ہو گیا جسے الفاظ سے تعبیر کرنا مشکل ہے، پھر جب طالب علمی اور تدریسی زمانے میں حضرت کا یہاں آنا ہوتا تھا، احقر ملاقات کا شرف حاصل کرتا، اور اپنی ان گنہ گار آنکھوں کو حضرت والا کے دیدار سے شرفیاب کر کے یہ تسکین کرتا کہ شاید یہ روحانی تعلق ومحبت گناہوں کا کفارہ بن جائے اور آخرت میں رفاقت کا سبب ہو جائے کہ آقائے مدنی کا ارشاد ہے: المرء مع

مَنْ اَحَبَّ (الحدیث)

سہ بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش تیرے ابرو میں تھی

دسیوں بار ان آنکھوں نے دیکھا کہ حضرت والا اتفاقاً بستی تشریف لاتے، یا مشرقی یوپی خصوصاً گورکھپور زون کا دورہ کرتے، مدرسہ ہٰذا کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرفیاب فرماتے۔ اس وقت واردین وصادرین کی بے تحاشہ آمد ہوتی اور عوام وخواص کا تانتا بندھ جاتا، کوئی ملاقات کا خواہاں تو کوئی صرف ایک نگاہ ناز کا منتظر، غرض عجیب منظر ہوتا، ایسا محسوس ہوتا کہ خدا تعالیٰ نے تمام کے تمام مسلمانوں کے دلوں کو حضرت والا سے وابستہ کر دیا ہے۔ اور اس خدامست مرد قلندر کا بھی حال یہ ہوتا کہ سب سے ملتے بلکہ بار بار تقاضہ فرماتے کہ اساتذہ کو بلاؤ! طلبہ سے ملاؤ! عوام سے ملنے دو! غرض سادگی کے اس پیکر کا (جس پر تمام رنگینیاں قربان تھیں) عجیب مقام تھا جو سفید لنگی کرتے میں ملبوس چوخانے کا رومال کاندھے پر ڈالے مشرق ومغرب ایک کئے ہوئے تھا۔

در دست نہ تیر است نہ در دست کمان است
این سادگی اوست کہ بسمل دو جہان است
در مدرسہ از جنبش لعل تو حکایت
در میکدہ از مستی چشم تو نشان است

اس مقام محبوبیت اور دونوں جہاں کے بسمل ہونے کا حضرت کی وفات کے دن پورا انکشاف ہو گیا، جب لاکھوں عقیدتمندوں کا سمندر رسولپورا نام کے ایک غیر معروف گاؤں میں موجیں مار رہا تھا، جہاں لوگ جہازوں، بسوں، ٹرکوں جیپوں، کاروں اور رکشوں سے امنڈے چلے آرہے تھے، مشرق ومغرب

شمال وجنوب غرض ہر طرف سے انسانوں کا قافلہ افتاں وخیزاں محویت کے عالم میں چلا آرہا تھا، چند گھنٹوں میں ہتھورا گاؤں انسانوں کا سمندر بن چکا تھا جہاں یا انسانوں کے سر نظر آتے تھے یا گاڑیوں اور سواریوں کا انبوہِ عظیم نہ کوئی ہنگامہ تھا، نہ شور تھا، ہر شخص آبدیدہ، ہر ایک کی آنکھیں اشکبار، اور ہر فرد بشر سوگوار تھا، اس دن ہر شخص خود کو یتیم محسوس کر رہا تھا، اسوقت اس چھوٹے سے گاؤں میں علم ومعرفت کا ایک روشن مینار جامعہ عربیہ کی شکل میں نظر آیا جس کے درودیوار زبانِ حال سے ماتم کناں، ساکت وصامت کھڑے تھے، یہ منظر دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں بہنے لگیں، اور آنسوؤں کے سیلاب سے جیب و داماں تر ہونے لگے کہ ہائے! کس محنت وجفاکشی اور اخلاص وللّٰہیت سے اس مردِ خدا نے ویرانے کو گل وگلزار بنا دیا ہے

ے اپنے لہو سے روشن کر دیں گلیاں اس ویرانے کی
گرچہ بہت تاریک تھیں راہیں شہرِ وفا تک جانے کی

درحقیقت حضرت والا کو یہ مقام آپکی جفاکشی، محنت ومشقت، جہدِ مسلسل، اخلاص وللّٰہیت، اور مخلوقِ خدا کی خدمت سے حاصل ہوا تھا، تاریخ میں آپ کا نام انہیں کارناموں سے زندہ وپائندہ رہے گا، اور ہمارے لئے حضرت والا کی زندگی میں اتباعِ سنت کا یہی نمونۂ عمل ہے جس پر چل کر ہم بھی خدا کے محبوب اور مخلوقِ خدا کے ہر دلعزیز بن سکتے ہیں۔

مورخ یوں جگہ دیتا نہیں تاریخ عالم میں
بڑی قربانیوں کے بعد پیدا نام ہوتا ہے

راہی بقا ہونے والی کچھ ہستیاں ایسی شان عبقریت اور محبوبیت کی حامل ہوتی ہیں کہ ان کی روح فرسا وفات کی خبر قلب و دماغ پر بجلی بنکر گرتی ہے، اور دلوں کو یک لخت تڑپا دیتی ہے، اس جانکاہ خبر سے اگر ایک طرف گہوارۂ علم و عمل میں صف ماتم بچھ جاتی ہے، تو دوسری طرف میخانۂ سلوک و معرفت میں اداسی چھا جاتی ہے، اگر جھونپڑیوں کے غربا و دلگیر نظر آتے ہیں، تو محلوں کے امراء بھی آزردہ خاطر دکھائی دیتے ہیں، اگر رنگ و نسل کے رسمی رشتہ دار ماتم کناں ہوتے ہیں تو محبت و عقیدت کا تعلق رکھنے والوں کے قلوب بھی غم و اندوہ، کا آتش دان بن جاتے ہیں ؎

آنکھیں اداس روح پریشان دل نڈھال
برپا ہوئی ہے ایک قیامت کہاں کہاں!

لیکن انسانوں کی یہ جنس بے بہا ہر دور میں کمیاب اور بسا اوقات نایاب ہو جاتی ہے انکی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ع بڑی مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا فرزانہ۔ ایسی ہی نادرۂ روزگار ہستیوں میں جنیدِ وقت شبلیٔ دوراں عارف باللہ حضرت

مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جنھوں نے اپنے بے پناہ دینی جذبہ اور ولولہ، بے لوث ملی خدمات اور اس کیلئے مثالی جانفشانی و جانکاہی، انسانیت نوازی، وغربا پروری، بے نظیر زہد و تورع جیسے دیگر اوصاف و محاسن کی بناء پر خلق خدا کے قلب و نگاہ میں سما کر بے پناہ مقبولیت و محبوبیت حاصل کرلی تھی۔

جب تک آپ باحیات رہے سروں کے تاج اور دلوں کی دھڑکن بن کر رہے ملک کے جس گوشہ میں تشریف لے جاتے لوگ اپنی آنکھوں اور قلب و روح کو فرش راہ بنا دیتے، عقیدت مند انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر امنڈ پڑتا، اور جب آپ نے اس عالم آب و گل سے کوچ کیا، تو اپنے پیچھے بلا تفریق مذہب و ملت و بلا امتیاز حسب و نسب ہزاروں کو سوگوار بنا گئے، کتنے محبین و معتقدین تڑپ اٹھے، مدتوں بیشمار سینے اپنے اندر اس دلدوز و جاں سوز حادثہ کی ٹیس محسوس کرتے رہیں گے، اور سیکڑوں آنکھیں آپ کی بہار آفریں و حیات افروز شخصیت کو یاد کر کے اشکبار ہوتی رہیں گی۔

ع　جب نام تیرا لیجے تب اشک بھر آوے

آپ علم و عمل، اخلاص وللہیت، سادگی و کفایت شعاری کا دلکش پیکر، تقویٰ و طہارت تضرع و انابت کا عبرت آموز نمونہ، زہد و قناعت، تواضع و انکساری، فیاضی و عالی حوصلگی کا ایمان افروز مجموعہ، کریم النفسی و شگفتہ مزاجی اور خوش اخلاقی و خوش گفتاری کا پر بہار گلشن تھے، تحمل و بردباری نے تو مجسم ہو کر آپکی صورت میں انسانی روپ دھار لیا تھا۔

آپ کی شفیق ذات ایک تناور و سایہ دار شجر تھی جس کے سائے میں آکر مختلف جماعتوں، اداروں اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد شفقت پدری اور آغوش مادری کا سرور و سکون محسوس کرتے تھے۔

حضرت قاری صاحبؒ ملت اسلامیہ کے تئیں اپنے سینہ میں ایک حساس اور بیقرار دل رکھتے تھے، جو ملت پر آنیوالی ہر مصیبت کے وقت بیتاب، اور تلملا اٹھتا تھا۔

ے　خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امت کا یہی درد وغم تھا جس نے آپکو شب کی تنہائیوں میں اشکبار ہوکر اپنے مولیٰ سے نالہ وفریاد کرنے کا خوگر، اور آہِ سحرگاہی کا عادی بنادیا تھا، یہ سوزِ دروں آپکو ہمہ وقت بے کل اور بےچین کئے رہتا تھا، اور آپکو ملک کے طول وعرض اور دور افتادہ وپسماندہ علاقوں میں لئے لئے پھرتا تھا، صبح کہیں ہوتی تو شام کہیں ڈھلتی، دن کہیں گذرتا تو رات کہیں بسر ہوتی، آپ کی متحرک وفعال داعیانہ زندگی علامہ اقبال کے اس شعر کی آئینہ دار تھی،

ے　جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

آپ موسم کی ناسازگاری وبے اعتدال سے بے نیاز، امراض واعذار سے بے فکر ہوکر، سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے لوگوں تک پہونچتے، ہزاروں خدا فراموش اور دین سے بیزار بندگانِ خدا کو اپنے پردرد وپراثر مواعظ کے ذریعہ خدا شناسی اطاعت شعاری، اور دین کے ساتھ وفاداری کا درس دیتے، انکو دین اور اہلِ دین کی تعظیم وقدر دانی، اور علماء ومشائخ سے ربط واستفادہ کی تلقین فرماتے، بسا اوقات وعظ کے دوران آپ کا پیمانۂ غم چھلک پڑتا، اور آپکی آواز گلوگیر ہوجاتی اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتیں، آپ کے سادہ اور خطیبانہ اداؤں سے عاری مواعظ اس قدر پرتاثیر اور دلکش ہوتے کہ سامعین کے دل کھنچتے ہوئے معلوم ہوتے، کتنی آنکھیں آبدیدہ ہوجاتیں، اور کتنے قلوب ایمانی جذبے سے معمور

اور عشق نبوی کی لذت سے مخمور ہو جاتے، ہزار ہا لوگ اپنی صورت و سیرت زندگی و معاشرت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا فیصلہ کر کے اٹھتے۔ ان دور دراز کے اسفار میں آپ مختلف مدارس عربیہ اور مراکز دینیہ میں بھی قدم رنجہ فرماتے، وہاں پر انکی دینی و ملی خدمات کو دیکھ کر کارکنان کو داد دیتے، اور انکی ہمت افزائی فرماتے اپنی قیمتی نصیحتوں اور مشوروں سے انہیں نوازتے، مایوس و غفلت کے شکار لوگوں کو ترغیب دیکر ان میں نیا عزم و حوصلہ پیدا کرتے، اس طرح آپنے اپنی برق رفتاری اور طبیعت کی بیتابی و بیقراری سے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں اور دنوں میں پورا کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذوق عبادت کا بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا، تلاوت کلام پاک، اذکار مسنونہ، ادعیۂ ماثورہ، اور نمازوں کا خاص اہتمام تھا، فرائض کے ساتھ نوافل خصوصاً تہجد کا بہت ہی زیادہ اہتمام تھا، صحت ہو یا بیماری، سفر ہو یا حضر، تازہ دم ہوں یا تھکن سے چور ہر حال میں سحر خیزی اور آہ نیم شبی کا اہتمام تھا اس کیلئے قوت و تازگی، نشاط و انشراح کہاں سے آجاتا، اس کی تاویل اسکے سوا کچھ نہیں کی جاسکتی کہ اس کا سرچشمہ تعلق باللہ اور عشق الٰہی تھا۔

اور عشق نبوی سے آپ کی سرشاری اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شیفتگی تو باعث صد رشک اور قابل تقلید تھی، آپ کی حیات مبارکہ کا ہر گوشہ اتباع سنت سے مزین و منور تھا، آپ کے ہر ہر عمل اور ادا سے ذات نبوی سے محبت و فریفتگی کا ظہور ہوتا تھا، اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ آپ کا یہ عقیدہ تھا

سے شہ کونین کی سنت پہ جو عامل نہیں ہوتا وہ کچھ بھی کر رہا ہو کچھ اسے حاصل نہیں ہوتا
کرشمے لاکھ دکھلائے ولی اسکو کہے کوئی گروہِ اولیاء میں وہ کبھی شامل نہیں ہوتا

آپ کے نزدیک مسلمانوں کی ذلت و رسوائی، بدحالی و پسپائی اور ان ڈھائے

جانیوالے مظالم کا بنیادی سبب ذات نبویؐ سے بے وفائی اور انکی اتباع سے گریز ہے۔

ے بتاؤں میں تمہیں ظالم کو یہ جرأت ہوئی کیسے
نبی کی راہ سے ہم ہٹ گئے ہیں بے وفا ہو کر

حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ لینت و مروت، وضعداری اور رواداری کے باوصف اسلامی غیرت و حمیت سے بھی بہرہ ور تھے، دین کے ایک ایک جزء اور اس سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی عظمت و محبت آپکے دل میں رچی بسی تھی، دین کے کسی بھی جزء سے دستبرداری یا اس میں کسی بھی قسم کی تحریف و تبدیلی کے لئے آپکی باحمیت اور غیور طبیعت کسی بھی قیمت پر تیار نہیں ہوتی تھی، آپ خلاف شرع امور میں کسی قسم کی مصلحت پسندی اور مداہنت کے قائل ہی نہیں تھے۔

ے بہت تحقیق کی تاقب ترا بس جرم یہ نکلا
خلاف شرع باتوں کا کبھی قائل نہیں ہوتا

حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ فطری طور پر بے ضرر اور صاف دل تھے، دوسروں کی رعایت و دلداری آپ کی فطرت ثانیہ تھی، کسی کی دلجوئی اور اشک شوئی میں آپکو ایک خاص قسم کا لطف و سرور اور بڑا کیف و انشراح محسوس ہوتا تھا، اپنے اس مخصوص اور ممتاز افتاد طبع کی وجہ سے بسا اوقات آپ کو اپنی صحت کے تعلق سے بڑی قیمت چکانی پڑتی تھی، لیکن باایں ہمہ آپ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے تھے، اور ہر ایک کا دل رکھ لیتے تھے، آپکا سہل الحصول ہونا آپکے اوصاف و کمالات میں سے ایک ممتاز وصف تھا، شاید آپ بے مروتی و بے وفائی اور دل آزاری و جفا کاری جیسے کریہہ الفاظ کے معانی و مفاہیم سے نا آشنا تھے۔

اس پر فتن و پر آشوب دور میں جبکہ مادیت و نفس پرستی و فحش کاری بے حیائی کے سیلاب بلاخیز میں بہت سے لوگ بہے چلے جا رہے ہیں حضرت قاری صاحبؒ

کی حیثیت ایک مضبوط بند کی سی تھی، آپ کا نفسِ وجودی بہت سے فتنوں کیلئے آڑ بنا ہوا تھا، امت کو ابھی آپکی بہت ضرورت تھی، آپکی ذات سے بہت سی امیدیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں، ملت اسلامیہ ابھی آپکے فراق کے صدمہ کو برداشت کرنے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اور تقدیری فیصلہ کے مطابق آپ ہم سے جدا ہو گئے، جس پر سرِ تسلیم خم کرنیکے علاوہ چارہ کار نہیں ہے، لیکن ضرورت ہے کہ آپ کی سیرت و کردار اور اوصاف و اخلاق کو نمونۂ عمل اور مشعلِ راہ بنا کر میدان عمل میں اترا جائے۔

؎ خوب ہے اے اربابِ محبت ذکر بیانِ عظمتِ رفتہ
لیکن غازی وہ ٹھیرے گا جو ماضی کو حال بنائے

اصل بزرگی یہی ہے

دل بالکل صاف آئینہ کی طرح ہونا چاہئے، کسی کی طرف سے دل میں کینہ کپٹ نہ ہو، یہ اس وقت ہو گا جبکہ سینہ کشادہ ہو، یعنی دریا بن جائے، جس طرح سمندر کنکر، پتھر سب کو اپنے اندر سمولیتا ہے اسی طرح ہمارا دل ہونا چاہئے، کہ ہر بات سننے اور برداشت کرنے کا مادہ ہو، سینہ آئینہ کی طرح صاف ہو، اصل بزرگی یہی ہے۔

(از۔ عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ)

وہ زمین کی پستیوں پر ایک بلند آسمان تھا، مادیت کے منڈلاتے ہوئے طوفان میں روحانیت کا رشک فلک مینار تھا، وہ محفل اسلاف کی یادگار بھی تھا اور درد و سوز اور فکر و گداز کا عمیق سمندر بھی، وہ ایک چلتا پھرتا زندہ دلی تھا، جی ہاں! وہ سب کچھ تھا لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم انسان تھا، ایسا انسان جس کے دیکھنے سے بیماروں کے چہروں پر رونق آجاتی، دردمندوں کے دلوں میں سرور و شادمانی کی لہریں دوڑ پڑتیں، رنجیدہ و افسردہ کلیوں میں اچانک بہار آجاتی، جس کا وجود محفل علم و دین کیلئے رشک صد ہزار گلستاں تھا، وہ اعلیٰ اخلاق اور انسانی صفات کا صرف مظاہرہ کرنے والا نہیں تھا بلکہ یہ سب چیزیں اس کے اندر اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ: شاخ گل میں جسطرح باد سحر گاہی کا نم

چمکتا ہوا روشن گول چہرہ، دمکتی ہوئی صاف چوڑی پیشانی، نور خدا کی پرتو

سفید نورانی لمبی گول داڑھی، میانہ قد، ڈھیلا ڈھالا نصف پنڈلی تک پہونچتا ہوا صاف شفاف سفید کرتا، کرتے کے نیچے ٹخنے کے کچھ اوپر تک جھلکتا ہوا سفید پائجامہ یا کبھی شفاف لنگی، سر پر سفید گول ٹوپی، چال میں غضب کی تیز رفتاری، ساتھ ہی بے پناہ وقار، گفتار میں نرمی و گرمی کا حسین امتزاج "نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز" کا سچا آئینہ دار، اس خداترس و خود آگاہ مرد قلندر کی خوبیوں کا کس طرح بیان ہو، اور ہمارا کیا منہ ہے کہ ہم اس مرد قلندر کا نام بھی اپنی گندی زبان سے لیں لیکن کیا کیا جائے اس محبت و عقیدت کا جو نہ صرف سیل اشک بہانے پر اکتفا کرتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ دل کو بھی رُلا دیتی ہے، اور جب دل رو دیتا ہے تو زبان و قلم بھی اسکے ساتھ رونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ کو سب سے پہلے میں نے لکھنؤ میں دیکھا تھا میری عمر اسوقت بارہ تیرہ سال کی رہی ہوگی لیکن خوب یاد ہے، اسلامیہ انٹر کالج میں کوئی دینی جلسہ ہو رہا تھا پنڈال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، سامنے اسٹیج پر کرسیاں لگی تھیں، قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیچ کی کرسی پر تشریف فرما تھے، کسی شعلہ بیان مقرر کی تقریر ہو رہی تھی تقریر پورے زور و شور سے چل رہی تھی کہ اچانک مجمع کے ایک گوشہ سے جیسے بجلی چمکی، کیمرہ کی فلش لائٹ اسٹیج پر پہونچی اور فوراً ہی قاری صاحبؒ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے، سامنے رکھی ہوئی میز پر زور سے ہاتھ مارا مقرر کی آواز گلے میں دب گئی، مجمع پر اچانک سکوت اور سناٹا چھا گیا، پھر قاری صاحبؒ کی پر جلال آواز فضا میں لہرانے لگی "خدا کے بندو! دینی جلسہ ہو رہا ہے اور تصویریں لی جا رہی ہیں، کوئی بھی شخص تصویر لینے کی ہرگز کوشش نہ کرے" دل میں اسی وقت "جلال صدیق" بیٹھ گیا۔

پھر بارہا ندوہ میں قاری صاحب کی زیارت اور ملاقات کا موقع ملتا رہا، استاذ محترم مولانا محمد زکریا صاحب سنبھلی مدظلہ کی زبان سے اکثر قاری صاحبؒ کے تذکرے سنے، بار بار تقریریں سننے کا بھی موقع ملا لیکن ندوہ کی مسجد میں کی گئی تقریر اور اس کا پس منظر و پیش منظر کبھی فراموش نہیں ہوتا، طلبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء کی انجمن "جمعیۃ الاصلاح" کی طرف سے اہم شخصیات کے توسیعی خطبوں اور محاضرات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس کے تحت پورے سال میں چار پانچ عظیم المرتبت شخصیات کی تقریروں کا نظم تھا۔ ابتداءً غالباً قاری صاحبؒ ہی کی تقریر اور محاضرہ سے ہوئی تھی، اس کیلئے قاری صاحبؒ سے باصرار وقت لیا گیا، ایسے موقعوں پر استاذ محترم مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ کی سفارش اور کوشش ہم لوگوں کے لئے شمع امید ہوا کرتی تھی، اس موقعہ پر بھی آنجناب کی مخلصانہ کوشش رنگ لائی، اور قاری صاحبؒ ندوہ تشریف لے آئے ندوہ کی وسیع مسجد میں بیان کا اہتمام کیا گیا، ندوہ کے تمام طلبہ قاری صاحب کی تقریر سننے کیلئے ہمہ تن گوش برآواز بیٹھ گئے، قاری صاحب کی تقریر شروع ہوئی اور تقریباً پون گھنٹہ تک ہوتی رہی، وہ تقریر کیا تھی؟ شروع تا آخر ہم طلبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے مسلسل ڈانٹ اور پھٹکار تھی جو لہجہ شروع میں تھا وہی لہجہ اخیر تک رہا، از اول تا آخر ڈانٹ ہی ڈانت تھی، کہ "میرے بھائیو! کیا ندوہ میں تمہارے اساتذہ نہیں ہیں؟ تمکو درس دینے والے اور پڑھانے والے نہیں ہیں، پھر تم نے "دوسرے" کو کیوں بلایا؟ تم اپنے اساتذہ کی باتوں کو کیوں نہیں سنتے، ان سے کیوں نہیں حاصل کرتے، تمہارے لئے میرے بھائیو! تمہارے اساتذہ ہی سب کچھ ہیں، تمہارے لئے سب سے بڑے مصلح سب سے بڑے خطیب، سب سے بڑے بزرگ اور سب سے بڑے مرشد ہی تمہارے

اساتذہ ہیں، تمہارے لئے یہی جنید و شبلی ہیں، تمہیں جو کچھ ملے گا انھیں سے ملیگا، پھر تم نے "دوسرے" کو کیوں بلایا؟ یہی مضمون پوری تقریر کا خلاصہ اور لب لباب تھا۔
یہ انداز بھی تقریر کا میں نے پہلی ہی مرتبہ دیکھا کہ "دوسرے" ہی نے آکر یہ تقریر کی اور "دوسرے ہی کے بلانے" ہی سے یہ باتیں معلوم ہوئیں، لیکن اسی "دوسرے" ہی کے بلانے پر مسلسل ڈانٹ اور عتاب چلتا رہا، اللہ والوں کا ہر انداز نرالا ہوتا ہے۔

یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ قاری صاحبؒ کی میری پہلی زیارت کے موقعہ پر میرے دل میں "جلال صدیق" بیٹھا تھا، اور ان کا آخری دیدار میرے دل میں ہمیشہ کے لئے "جمال صدیق" کے لازوال اور انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔
ندوۃ العلماء کے مہمانخانہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی تشریف فرما ہیں، قاری صاحبؒ حضرت مولانا کی ملاقات کیلئے ندوہ تشریف لاتے ہیں، ندوہ سے باہر حضرت مولانا باقر حسین صاحبؒ امت برکاتہم صدر دارالعلوم الاسلامیہ بستی کو قاری صاحبؒ کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے، آپ بھی فوراً ندوہ کے مہمانخانہ میں آموجود ہوتے ہیں، ساتھ میں مولانا ظہیر انوار صاحب ناظم دارالعلوم الاسلامیہ بستی اور یہ ناچیز بھی ہے، اب میرے سامنے ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کی دو عظیم شخصیتوں کی ملاقات کا منظر ہے، روحانیت و سکینت میں ڈوبا ہوا منظر، دونوں بزرگوں کی اچھی میٹھی باتیں کرنے کا منظر، ایسا حسین منظر اب دیکھنے کو کہاں ملے گا، تھوڑی دیر بعد وہ مجلس برخاست ہوجاتی ہے، حضرت مولانا قاری صاحبؒ مہمانخانہ سے باہر تشریف لاتے ہیں، سکنڈوں میں ندوہ کے اندر قاری صاحبؒ کی آمد کی اطلاع پھیل جاتی ہے، اساتذہ والہانہ انداز میں دیوانہ وار قاری صاحبؒ کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں، مولانا سید عبد اللہ

حسنی ندوی مدظلہ تیز قدموں سے بڑھتے ہوئے قاری صاحب سے بغلگیر ہوجاتے ہیں، آگے بڑھکر مولانا سید سلمان حسینی ندوی مدظلہ سے پرتپاک ملاقات اور معانقہ ہوتا ہے دیکھتے ہی دیکھتے اساتذۂ کرام کی بھیڑ جمع ہوجاتی ہے، قاری صاحبؒ ندوہ کے بڑے اساتذہ سے بغل گیر ہوتے ہوئے دیر تک انکی پیٹھوں کو شفقت و محبت سے تھپتھپا رہے ہیں، ہر طرف خوشی و مسرت چھلک رہی ہے، اسوقت قاری صاحب کے چہرہ کی بشاشت اور صاف جھلکتی ہوئی خوشی و شادمانی بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، خوشی میں بات کے دوران بار بار قاری صاحبؒ کے چمکتے ہوئے صاف ستھرے دانت کھل کھل جاتے، اور دیکھنے والا "جمالِ صدیق" کا لطف لینے لگتا

حضرت قاری صاحبؒ کے تعلق سے میری زندگی کا پہلا اور آخری مشاہدہ قاری صاحبؒ کی پوری زندگی پر روشنی ڈالتا ہے، قاری صاحبؒ کی ذات بلاشبہ جلال و جمال کا ایک دلکش حسین سنگم تھی، قاری صاحب حق کے معاملہ میں کسی قسم کا ذرا بھی لوچ برداشت کرنے کے روادار نہیں تھے، سیکڑوں واقعات اسکے شاہد ہیں کہ آپ نے دوسروں کی پرواکئے بغیر برسرِ عام حق بات علی الاعلان کہی، دین کا کوئی مسئلہ ہوتا یا لوگوں کی طرف سے دینی غفلت اور تساہل کا کچھ مظاہرہ ہوتا تو قاری صاحبؒ تڑپ اٹھتے، اور بہت صاف صاف لوگوں کے دلوں پر حق کی چوٹ لگاتے، آپ کی تقریریں اور بیانات اس کا واضح ثبوت ہیں، لیکن جب آپ اپنے لوگوں میں ہوتے تو انتہائی نرم دل، نرم خو، خوش گفتار، شیریں بیان، ہشاش بشاش، سب کے محبوب نظر آتے تھے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جلال و جمال کے یہ دلکش جلوے قاری صاحبؒ کی زندگی کے ہر ہر گوشہ میں

نمایاں ہیں، ایک ہی وقت میں ایک طرف پورے غیظ و غضب کیساتھ ڈانٹنا اور اسی لمحہ دوسری طرف روئے سخن کر کے انتہائی شیریں اور دل کو موہ لینے والی بات کرنا قاری صاحبؒ کا ایسا کمال تھا جو صرف ایمان کی پختگی، خدا ہی کیلئے ہر کام کرنے اور اسی کیلئے خوش اور ناراض ہونے کی علامت اور نشان تھا، اس طرح کے سینکڑوں واقعات اور جلال و جمال کے ہزارہا جلوے ہمہ وقت کے حاضر باش اور قاری صاحبؒ سے قریبی تعلق رکھنے والوں نے دیکھے ہونگے۔

جلال و جمال کا یہ جوئے رواں پورے ۸۲ سال تک سبک روی اور تیز رفتاری سے بہتا رہا، کتنے دل اس سے شاد کام ہوئے، کتنی آنکھوں کو جلا ملی، کتنے ویرانے آباد اور بنجر علاقے شاداب ہوئے، اور پھر اچانک یہ حسین نظارہ ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو گیا، جانیوالا چلا گیا لیکن اس کی یادیں اور اس کی باتیں ہمیشہ ہمارے دلوں کو برماتی اور گرماتی رہیں گی۔

رفتید و لے نہ از دلِ ما

......لیکن تو چیزے دیگری

از: مولانا شہاب الدین ندوی
استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

حضرت قاری صاحبؒ بلاشبہ پیغمبرانہ اوصاف اور نبوی اخلاق کے مالک تھے، عظیم و نمایاں کارناموں کا ایک سنہرا سلسلہ آپ نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے جنکے تفصیلی جائزے کا یہ موقع نہیں، اسوقت میں صرف حضرت کے بلند پایہ اخلاق کے سلسلے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں، جنھوں نے آپکو ہزارہا انسانوں کے دل و نگاہ میں بٹھا دیا تھا، اور اور خلقِ خدا میں بے انتہا مقبول بنا دیا تھا، اور جنکی کرشمہ سازی اور معجز نمائی تھی کہ لاکھوں بندگان خدا کے دلوں میں حضرت قاری صاحبؒ کیلئے ایسی عام مقبولیت اور محبوبیت پیدا ہو گئی تھی جس کی مثال ملنی مشکل ہے، جسکا دلفریب منظر ہماری آنکھوں نے ایکی زندگی میں بارہا دیکھا ہے، اور انتقال پر بھی سبھی کی آنکھوں نے اسکا مشاہدہ کیا۔ زندگی میں تو یہ حال دیکھا کہ آپ جس جگہ تشریف لے جاتے، جہاں قیام فرماتے جس طرف سے گزرتے، عقیدتمندوں کا ایک بے پایاں ہجوم آپکے ساتھ ہو جاتا، زیارت کرنے اور دعا کرانے والوں کا تانتا بندھ جاتا، آپ خندہ روئی سے ہر ایک سے ملتے، ہر ایک کو دُعا دیتے، تعویذ لکھتے، کسی کو بھی مایوس و محروم واپس

نہ کرتے، وہ انسانوں سے بے پناہ محبت اور سچی ہمدردی رکھتے تھے، دوسروں کا دل رکھنا آپ کا شیوہ تھا، کسی کا دل توڑنا آپ جانتے ہی نہ تھے، لوگ آپکے اس مزاج سے بخوبی واقف تھے، علاقے میں نئے ٹرک وٹریکٹر خریدے جاتے تو متعلقین حضرت ہی سے درخواست کرتے، اور آپ لوگوں کی دلداری فرماتے ہوئے، ان گاڑیوں کی سیٹوں پر بیٹھ کر ان کا افتتاح کر دیتے، اور دعا کر دیا کرتے تھے، کسی جلسہ، مدرسہ، تقریب اور دعوت و تبلیغ کے مواقع میں شرکت سے انکار تو کجا معذرت تک نہیں کرتے تھے، خواہ بیمار ہی کیوں نہ ہوں۔

آپکی جامع وہمہ گیر شخصیت میں ایک اہم چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ آپ اپنے سینے میں ایک تڑپتا ہوا دل اور بے چین ومضطرب طبیعت رکھتے تھے، اور یہ تڑپ واضطراب اور بے کلی وبے چینی کسی اور چیز پر نہیں بلکہ پھیلی ہوئی ضلالت وجہالت خدا بیزاری وخود فراموشی، دین وعلم سے دوری اور اخلاق نبوی سے بیگانگی پر تھی، وہ موجودہ ماحول کی ابتری اور مسلمانوں کی غفلت وبے حسی لبے راہ روی و بے دینی کو دیکھ کر کڑھتے، اور پہروں اشک خوں بہاتے، اور دن کے ہنگاموں میں انکی دعوت واصلاح اور ہدایت ورہنمائی کیلئے سرگرم وکوشاں رہتے، اور رات کے سکوت وتاریکی میں وہ اپنے کریم آقا کے سامنے گریہ کناں نظر آتے، بلاشبہ وہ سچے جذبۂ دعوت سے ہمہ وقت سرشار رہتے، اور اس راہ کے خاروں کو گل تر خیال کرتے تھے۔

اسی فکر وتڑپ ہی کا نتیجہ تھا کہ اہل تعلق آپکو معمولی معمولی تقریبوں میں بھی مدعو کر لیا کرتے تھے، اور آپ کی کریم النفسی، وسعت ظرفی اور دوراندیشی تھی کہ آپ ان دعوتوں کو قبول فرماتے، اور اپنے بے شمار اعذار کے باوجود دور دراز گاؤں دیہات کے دشوار گزار وپر مشقت سفر کی صعوبتیں جھیل کر عقیقہ وختنہ تک کی

تقریبات میں پہونچتے، اس سلسلے میں وہ اپنے آرام وراحت کا خیال تو کجا! اپنی بیماریوں تک کی پرواہ نہیں کرتے تھے، آپ اس شرکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کا ابدی و سرمدی پیغام وہاں کے لوگوں کو سنا ڈالتے اور بڑے دردبھرے انداز میں انکے سامنے اصلاحی باتیں رکھتے، آپ کے ان پراثر مواعظ سے نہ معلوم کتنے خاندان وعلاقے راہ یاب ہوگئے، کتنی بدعات وخرافات کا جنازہ نکل گیا اور اصلاح وہدایت کی کیسی جانفزا و روح پرور ہوائیں چلیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی میں دشوار گزار دعوتی واصلاحی اسفار کا یہ تسلسل اگر کسی چیز کا پتہ دیتا ہے تو وہ ہے اصلاحِ امت کی بے پایاں فکر اور انسانیت کی فلاح ونجات کی تڑپ، آپ اس راہ میں آرام وسکون کے معنی سے نا آشنا، اور رات دن کے فرق سے ناواقف تھے، بلاشبہ راہِ حق کی بے مثال قربانیاں وجانفشانیاں آپکے عزم راسخ، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا پتہ دیتی ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کو خدا نے ایسا باطنی نور اور ایسی روحانیت وللّٰہیت عطا فرمائی کہ آپ کی باتوں اور نصیحتوں، تقریروں ومجلسوں کا عجیب جادوئی اثر ہوتا تھا، بلا کی تاثیر کشش اور سحر انگیزی ہوتی تھی، طبیعتیں آپکے وعظ وتقریر سے معمولی اکتاہٹ بھی نہیں محسوس کرتی تھیں، آپ کے بارے میں یہ زبان زدِ خاص وعام تھا کہ انھیں دیکھ کر خدا یاد آتا ہے، اور ان کے ساتھ چند لمحے گزار کر ایمان تازہ ہوتا، اور عملِ صالح کا جذبہ موجزن ہوتا ہے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ حضرت قاری صاحبؒ خدا کے ایک انتہائی مقرب اور ملکوتی صفات کے حامل بندے تھے اور خدا کے نیک بندوں، اللہ کے ولیوں اور بزرگانِ دین کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔

آپ مہمانوں کی آمد سے بہت خوش ہوا کرتے تھے، انکی خاطر مدارات کرتے اور ان کے اعزاز واکرام کی آخری حد تک فکر رکھتے تھے، آپ کی ضیافت کا

انداز بھی بڑا عجیب و نرالا ہوتا تھا، ایک مرتبہ بتقو ر ا مدرسہ میں چند مہمانوں کے ساتھ مجھے بھی حضرت کے دسترخوان پر بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تو یہ منظر دیکھا کہ حضرت قاری صاحبؒ مہمانوں کے اعزاز میں دسترخوان پر بیٹھے ضرور رہتے، اور گاہے گاہے کچھ لقمے بھی لے لیتے تھے، گرچہ یہ بیٹھنا صرف مہمانوں کی دلداری کیلئے تھا، ورنہ مہمانوں کے کھلانے، ان کے تمام چیزیں پہونچانے کے لئے آپ مسلسل فکر مند اور بے چین نظر آتے، اور بار ہا خود ہی اٹھ اٹھ کر ان کے پاس جاکر مختلف چیزیں پیش کرتے، اس بے پناہ نوازش اور بزرگانہ عنایت کو دیکھ سبھی انگشت بدنداں رہ گئے، اور بیحد متاثر ہوئے۔

اس جمال کے پہلو میں حضرت قاری صاحبؒ کا جلالی رنگ بھی کبھی کبھی ظاہر ہو جایا کرتا تھا، اس وقت حضرت پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی، اور لوگ دہشت زدہ رہ جاتے، اور ایک عجیب ہی منظر ہوتا تھا، مگر آپ کی یہ پُرجلال گرج اپنا ایک خاص اثر رکھتی تھی جس کو لوگ کھلی آنکھوں دیکھ لیتے، اس طرح آپ کی ذات و الاصفات میں خدا نے جلال و جمال کا بڑا حسین امتزاج رکھدیا تھا، اور یہ آپ کی زندگی کے دو انتہائی نمایاں وصف تھے۔

غرضیکہ آپ کا وجود ایک ایسا شجر سایہ دار تھا جس کی گھنیری چھاؤں سے ہر راہی ہمہ وقت فائدہ اٹھاتا خواہ وہ امیر ہو یا غریب، اپنا ہو یا پرایا، پڑھا لکھا ہو، یا ان پڑھ، دیہاتی ہو یا شہری، اسی کے ساتھ آپ کی شخصیت علم و فن کا ایسا چشمۂ شیریں تھی جس کے پاس تشنگانِ علوم دور دور سے کھنچ کر آتے اپنی علمی پیاس بجھاتے، اور خوب خوب سیراب ہو کر واپس جاتے، مریضانِ قلوب کیلئے آپ مخلص روحانی طبیب بھی تھے جو انتہائی اکسیر نسخۂ شفا تجویز کرتے اور دوائے دل بھی بانٹتے، سلوک و معرفت کے رہ نوردوں اور راہِ طریقت کے

سالکوں کے بھی آپ مرکز توجہ تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ اس راہ کے اصول وآداب کو سیکھتے، اور اسے انتہائی خوش اسلوبی سے طے کرتے، اور تزکیہ نفس وطہارتِ باطن کا بیش بہا فائدہ اٹھاتے۔ آپ کی ذات رشد وہدایت کا ایک ابر نیساں تھا جو بلا امتیاز ہر گھاٹی ووادی پر برستا، اور لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق خوب بہرہ ور اور مستفید ہوتے، بلا شبہ حضرت قاری صاحبؒ کو قریب سے دیکھنے والا، اور آپ کی شخصیت کو بغور پڑھنے والا بیساختہ یہ کہہ اٹھتا ہے کہ آپ کی دلنشیں شخصیت، انسانیت وشرافت اور جمال وجلال کا حسین پیکر، اطاعت وبندگی اور تقوی وطہارت کا دلآویز مجسمہ، علم وفضل، اور حسن اخلاق کا بے مثال نمونہ تھی، فیاض ازل نے اپنے دریائے کرم سے انھیں بے پایاں خوبیوں اور محاسن سے نوازا تھا۔

غرضیکہ وہ ایک ایسی پرکشش، دلنواز، ہمہ گیر وہمہ جہت شخصیت تھی جس کے ہزاروں فیض یافتہ اور بے شمار عقیدت مند تھے، اور یہ سب پرتو تھا اس عشق حقیقی کا جس کا جلوہ آپکے دل کے نہاں خانہ میں موجود تھا، کتنا لکھا جائے، اور کیا کیا کہا جائے بلاشبہ خدا کے کرم سے آپ بہت کچھ تھے، اور بہتوں میں ایک تھے، اپنے رنگ کے نرالے، اور اپنی شان کے البیلے ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اوصاف کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے، تاکہ لوگ انکے نقوشِ قدم کو مشعلِ راہ سمجھتے ہوئے اپر عمل پیرا ہوں، کیونکہ محبت کی اصل علامت اطاعت کے سوا کچھ نہیں ہے اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيعٌ ۔

(۱) حضرت مولانا کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود بغض وعناد، ترکِ تعلق تو دور کی بات میل ملاقات میں بھی سرِ مو فرق نہیں آیا دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں اختلافات پیدا ہوئے اصحابِ معاملہ دو حصّوں میں تقسیم ہوگئے، مگر جب کبھی دیوبند یا سہارنپور تشریف لاتے تو فریقین سے یکساں انداز میں ملاقات فرماتے، یہی وجہ ہے کہ دیوبند اور سہارنپور کے دونوں گروہوں کے سرکردہ حضرات بھی مولانا موصوف سے والہانہ تعلق کا اظہار کرتے تھے، دونوں فریق کے یہاں انکی شخصیت مسلم تھی، جبکہ بڑے بڑے حضرات اس خانہ جنگی میں شجرۂ ممنوعہ بن کر رہ گئے۔

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کے خلوص میں ایسی مٹھاس تھی کہ حالات کی کڑواہٹ بھی اسے مات نہیں دے پائی۔

(۲) دوسرا قیمتی وصف یہ تھا کہ وہ اپنی مختلف النوع مشغولیات گوناگوں ذمہ داریوں، دائمی اسفار، مدرسے کے انتظامی بوجھ کے باوجود تدریسی مشغلہ سے کبھی سبکدوش نہیں ہوئے، جس وقت سفر سے واپسی ہوئی، درس شروع، وہ بھی درس نظامی کی چیدہ، اور اپنی صعوبت میں شہرۂ آفاق کتب کا درس مثلاً، سلّم العلوم، شرح جامی، بخاری شریف وغیرہ، یہیں سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوجاتی ہے کہ مولانا حد درجہ جیّدالاستعداد، ذکی الفہم، قوی الحفظ وسیع المطالعہ، اور علمی استحضار رکھنے والے عالمِ دین تھے، ورنہ ان کتابوں کی تدریس کیلئے کہنہ مشق مدرس بھی بغیر تازہ مطالعہ کے درسگاہ میں قدم رکھتے

حضرت مولانا کے خصائل و فضائل کی تشہیر یا اشاعت کا مقصد وحید ظاہر ہے، کہ ہم جیسے ناخلف اپنے سلف سے عبرت لیں، قدیم اسلاف کے تذکرے، انکے مجاہدات کی داستان، محیّر العقول مآثر، مجسمۂ حیرت بنا دینے والی حکایات زندگی کو سنکر پست ہمّت، کسل و کاہل کے خوگر نفوس یہ کہکر چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس زمانہ کی بات اور تھی، یا اسوقت وہ رکاوٹیں نہ تھیں جو اب ہیں، یہ حضرات خیر القرون سے قریب تھے وغیرہ وغیرہ، مگر زیر تذکرہ بزرگ کے اوصاف و مجاہدات علمی و ملّی خدمات جلیلہ، اسی زمانہ اور اسی ماحول انھیں رکاوٹوں کے درمیان تھیں، کیا منہ ہے کسی کا، کہ وقت اور زمانہ کو کوسے، کم ہمتوں کا شیوہ ہمیشہ شکوہ سنجی رہی، بلند کردار وں نے ہمیشہ مصائب و مشکلات کو لوازم زندگی سمجھ کر اپنے عزم و ہمّت سے مردانہ وار مقابلہ کیا، آخر ظفر و نصرت ان کے سامنے قدمبوس ہوئی، ایسے جیالے اور کفن بردوش ہی دین محمدی کے چمن کی آبیاری کیلئے راحت و آرام قربان کرکے اپنی عزّت و آبرو، شہرت و رفعت کو پس پشت ڈال کر، مال و زر کی کشش اور دنیاوی زیب و زینت سے منہ موڑ کر دامے، درمے، قدمے سخنے مستعد رہے، اور ساری توانائی کا اوّلین و آخریں مرکز "دین قیّم" کی باغبانی کو بنایا، جس کے نتیجہ میں یہ شجرۂ طیّبہ برگ و بار لا رہا ہے، اسی کاروان دعوت و عزیمت کے ایک نمایاں رکن حضرت قاری صدّیق احمد صاحب طاب ثراہ بھی تھے، جنکی جسمانی و روحانی عزیمت کے سامنے راہ کی ہر چٹان پگھل کے رہ گئی، زمانہ کے مدّ و جزر، وقت کی ستم ظریفی، حالات کی تلخی نے انکے پائے استقامت کے سامنے ہمیشہ گھٹنے ٹیکے۔

آخر وہ کیا اوصاف تھے جن سے ان کا دائرۂ کار وسیع تر ہوتا چلا گیا، عوائق و شدائد کے بادل چھٹے، اور فوز و کامرانی استقبال کرتی گئی، ذیل میں انھیں

اوصاف کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، تاکہ لوگ انکے نقوشِ قدم کو مشعلِ راہ سمجھتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہوں، کیونکہ محبت کی اصل علامت اطاعت کے سوا کچھ نہیں ہے اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيْعٌ ۔

(۱) حضرت مولانا کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود بغض وعناد، ترکِ تعلق تو دور کی بات ہمیں ملاقات میں بھی سرِمو فرق نہیں آیا دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں اختلافات پیدا ہوئے اصحاب معاملہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، مگر جب کبھی دیوبند یا سہارنپور تشریف لاتے تو فریقین سے یکساں انداز میں ملاقات فرماتے، یہی وجہ ہے کہ دیوبند اور سہارنپور کے دونوں گروہوں کے سرکردہ حضرات بھی مولانا موصوف سے والہانہ تعلق کا اظہار کرتے تھے، دونوں فریق کے یہاں انکی شخصیت مسلم تھی، جبکہ بڑے بڑے حضرات اس خانہ جنگی میں شجرۂ ممنوعہ بن کر رہ گئے۔

حضرت قاری صاحب علیہ الرحمہ کے خلوص میں ایسی مٹھاس تھی کہ حالات کی کڑواہٹ بھی اسے مات نہیں دے پائی۔

(۲) دوسرا قیمتی وصف یہ تھا کہ وہ اپنی مختلف النوع مشغولیات گوناگوں ذمہ داریوں، دائمی اسفار، مدرسے کے انتظامی بوجھ کے باوجود تدریسی مشغلہ سے کبھی سبکدوش نہیں ہوئے، جس وقت سفر سے واپسی ہوئی، درس شروع، وہ بھی درس نظامی کی چیدہ، اور اپنی صعوبت میں شہرۂ آفاق کتب کا درس مثلاً، سلّم العلوم، شرح جامی، بخاری شریف وغیرہ، یہیں سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ مولانا صد درجہ جیّد الاستعداد، ذکی الفہم، قوی الحفظ وسیع المطالعہ، اور علمی استحضار رکھنے والے عالم دین تھے، ورنہ ان کتابوں کی تدریس کیلئے کہنہ مشق مدرس بھی بغیر تازہ مطالعہ کے درسگاہ میں قدم رکھتے

ہوئے تأمل کرتا ہے،

حضرت موصوف کو بیک وقت متعدد علوم وفنون پر پوری گرفت حاصل تھی، اس لئے سبق میں حق تلفی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، قلم گوہر بار سے نکلی ہوئی متعدد تصانیف صدقۂ جاریہ علوم نافعہ ہونیکے باسوا انکی علمی عظمت پر حجت قاطعہ بھی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ معاصرین ہوں کہ سابقین، مشائخ طریقت کی طویل فہرست میں خال خال ہی ایسے حضرات نظر پڑتے ہیں جو جید الاستعداد ہوں اسا لیکن ومسترشدین کو دوائے دل دینے کے ساتھ ساتھ مسند درس پر بھی اپنا لوہا منوا سکیں، مگر یہاں یہی نہیں بلکہ بیعت وارشاد کے علاوہ نظم مدرسہ، متعدد اداروں کی سرپرستی، اسفار کا لامتناہی سلسلہ، تصنیف وتالیف اور دقیق کتابوں کی ضخیم شروح کا مستقل معمول، اس کے باوجود تدریس کا بار اٹھانا اور پوری مستعدی سے اسکی تکمیل ایک عظیم کرامت سے کسی بھی طرح کمتر نہیں ہے، شاید حضرت ملتی علیہ الرحمہ کے بعد اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، جن اساتذہ کرام کی توجہات کا مرکز صدفی صد درس وتدریس ہی صبح وشام کا واحد مشغلہ ہے پھر بھی نصاب کی تکمیل سے گریز، تبدیلئ کتاب سے وحشت، محدود مطالعہ پر اکتفا کرنا ایک عام بات ہے۔

(۳) مولانا مرحوم ومغفور کی تیسری خصوصیت مذکورہ دو خصوصیات سے از خود سمجھ میں آتی ہے، وہ وقت کی قدر وقیمت کو پہچاننا، زمانہ کے ایک منٹ سے خراج وصول کرنا، بیکاری وپست ہمتی سے شدید بیزار رہنا، وقت کی کلائی موڑ کر اپنے تابع کرنے کا جذبۂ بلند، اور اس کے لئے ہر طرح کی ایثار وقربانی پیش کرنا، کم خوش نصیب ہیں جو دنیا جاتے ہیں تو انکے پیچھے خدمات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔

حضرت مولانا کی حیات جد وجہد کا دوسرا نام تھا، وہ ان لوگوں میں نہ تھے،

جو ناساعد حالات کا شکوہ کریں، اسباب کے فقدان کا رونا روئیں، مال و زر ہی انکے نزدیک ترقی کا اولیں و آخریں ذریعہ ہو، خالق سے زیادہ مخلوق پر نظر رکھتے ہوں، نہیں! بلکہ وہ ان سرفروشوں میں تھے جو ع سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں۔ کا شعار رکھتے ہیں، اکھوڑا جو عمومی دیہاتی وسائل سے بھی عاری ہے محل وقوع ایسے خونخوار رہزنوں کے درمیان ہے کہ اس کا نام ہی توحش کیلئے بہت کافی ہے، ایسی جگہ کسی دینی درسگاہ کا قائم کرنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں۔

اور حضرت اقدس کی ثبات قدمی، صبر و استقامت، شجاعت و جوانمردی اور اسکے ساتھ اخلاص و تعلق مع اللہ، اخلاص، توکل و زہد کی مجموعی دلیل ہے، علم و عمل کے اس باغ و چمن کی آبیاری میں کن صبر آزما مرحلوں سے وہ گذر رہے ہونگے آزمائش کے کتنے طوفانوں، مشکلات کے کتنے تھپیڑوں کا سامنا انکے ناتواں جسم نے کیا ہوگا، مگر سارے زلزلے اور طوفان انکے جبل استقامت سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئے۔

ے نشیمن پر نشیمن اسقدر تعمیر کرتا جا!
کہ بجلی گرتے گرتے آپ خود بیزار ہو جائے

اپنے کو مشکلات کا ایسا خوگر بنایا کہ انکی راہ میں آنیوالی دشواریوں کی سموم ان کیلئے گویا باد صبا بن جاتی تھی۔

ے چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

(۴) چوتھا وصف، بلکہ سارے اوصاف کی اساس۔ انکی کسر نفسی ہے۔ فروتنی و تواضع، غرور و پندار کے جذبات کو روند دینا، نفس امارہ کے کید سے

اپنے کو بچا لینا، کون نہیں جانتا کہ سب سے زیادہ قحط اسی وصف کا ہے، مگر حضرت قاری صاحبؒ موصوف اس محمود صفت سے سب سے زیادہ مالا مال تھے انکی تواضع شاید انکی ذات سے زیادہ مشہور تھی، زائر اوّل وہلے ہی میں انکی ہیئت ظاہری کے دیدار سے بے ساختہ اس وصف کا تأثر قبول کئے بغیر نہیں رہ پاتا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہی تواضع انکی رفعت و بلندی کا بنیادی راز ہے۔

نصف ساق تک لنگی باندھے، لمبا کرتا، معمولی درجہ کا خانہ دار رومال کندھے پر، چھریرا جسم، چہرہ پر مسکراہٹ، گھنی داڑھی، گول ٹوپی، کسی قدر تیز رفتاری سے قدم بڑھاتے ہوئے کوئی دیکھے تو عالم بھی باور نہ کرے، چہ جائیکہ دنیائے ولایت کا شہباز تصوّر کرے، مگر عقیدت مندوں کا ہجوم اور وارفتگی اور علماء کا رجوع انکے شریعت و طریقت کا حامل ہونیکے راز سے پردہ اٹھا ہی دیتا تھا، جہاں تک اندازہ ہے مولانا طبعاً قلیل الکلام تھے، گفتگو کم، مگر خیر الکلام ما قلّ و دلّ۔ کا مصداق، بڑی سادگی سے مشورہ دیتے تھے۔

برتنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ مشورہ الہامی اور "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" کا مصداق تھا، دیوبند جب کبھی تشریف لاتے تو خوانوادۂ اکابر اور دیگر بعض مؤقر شخصیات کے دولت کدہ پر بنفسِ نفیس حاضر ہوکر ملاقات فرماتے، راقم سطور کے والد ماجد حضرت مولانا سیّد ارشاد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مبلغ دار العلوم دیوبند سے بڑے تعلق و محبّت کا معاملہ فرماتے تھے، دیوبند آمد پر ہمیشہ ملاقات کیلئے قدوم میمنت لزوم سے نوازتے تھے، والد صاحبؒ نے بعض دفعہ خود جانے کی کوشش کی، مگر منع کر دیا کہ میں خود ہی حاضر ہونگا والد صاحب نہ بھی ہوتے، تو مکان پر ضرور تشریف لاتے، اور ہم خوردوں پر دستِ شفقت رکھ کر دعا فرماتے تھے۔

حضرت مولاناؒ کی بلند حوصلگی، رواداری اور احترام شریعت کی ایک جھلک اس واقعہ سے بھی سامنے آتی ہے کہ ایک دفعہ والد صاحب ہتھورا تشریف لے گئے، اس وقت تک مدرسہ میں مسجد نہ تھی، ادھر ہمارے والد صاحب مسجد کی جماعت کی نماز کے سلسلہ میں آخری درجہ کے غیور و حساس واقع ہوئے تھے، اس عنوان پر کوئی عذر انکے نزدیک مسموع نہ تھا، اس بارے میں ان کا ذاتی و عملی تصلب اتنا مضبوط تھا کہ اس کی نظیر ڈھونڈنے سے ملنی مشکل ہے، سفر و حضر میں یکساں کیفیت رہتی تھی، اس کیلئے ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کیلئے تیار رہتے تھے، ہتھورا میں مسجد نہ پاکر ان پر جو گزری گزر گئی، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ اس دوران جمعہ آگیا، پیمانۂ صبر لبریز تھا، اس لئے ہتھورا میں ظہر (بروز جمعہ) پڑھنے سے انکار کر دیا، تو حضرت مولاناؒ جمعہ پڑھوانے کے لئے خود باندہ تشریف لائے، واپسی کے وقت والد صاحب نے صاف فرمادیا کہ آپ کے یہاں مسجد نہیں ہے، میں آئندہ کبھی نہ آؤں گا، حضرت مولانا بھی کب اس کو برداشت کرنے والے تھے، کہنے لگے کہ مسجد ابھی بنے گی، اور اسی وقت ساتھ تشریف لے گئے، اور ایک خاص جگہ مسجد کیلئے متعین فرمادی، اور داغ بیل پڑگئی، آج اسی جگہ وسیع و عریض مسجد بنی ہوئی ہے، اس قدر فروتنی و تواضع اور خدا ترسی وہ بھی کسی مقتدا کے اندر کہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔

والد صاحبؒ کی ٹرین رات میں تھی، ہتھورا سے باندہ شب کا سفر انتہائی پر خطر ہوتا تھا، بعافیت آمد کی شکل صرف یہی تھی کہ حضرت مولاناؒ خود زحمت فرمائیں چنانچہ موٹر سائیکل سے خود حضرت نے باندہ تک پہونچا دیا۔

حضرت مولانا مرحوم کی یہی صفات و عادات تھیں جن کی بدولت ان کو یہ مقام بلند ملا، ان سے عقیدت مندی اور تعلق کا حق یہ ہے کہ ان صفات سے اپنے کو حتی المقدور مزین کریں ورنہ محض "پدرم سلطان بود" کا وظیفہ کسی نتیجہ کا حامل

بقیہ صفحہ ۲۱۲ پر

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ

چند غیر معمولی واقعات

از : مولانا حافظ انصار اللہ قاسمی - استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

وہ چراغِ علم و دانش وہ امیر کارواں — وہ متاعِ قوم و ملت نازشِ ہندوستاں
آہ وہ پیرِ طریقت، عالم روشن ضمیر — زینتِ بزمِ تصوف عاشقِ ربِّ قدیر

یہ دور قحط الرجال ہے، اللہ کے مخصوص بندے اس دار فانی سے رخصت ہوتے جارہے ہیں، انسانیت کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ کی صحیح مصداق ہوچکی ہے۔ اگر آج کوئی آدمی کی تلاش میں چراغ لیکر نکلے تو ہم اس سے کہیں گے کہ چراغ کی لو ذرا تیز کر اور ضلالت و گمراہی کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں سے گذر کر کسی اللہ والے سے مل! ورنہ تو نامراد و ناکام ہی لوٹے گا،

حضرت والا اپنی ساری زندگی اطاعتِ خداوندی اور اتباعِ رسول ﷺ میں گزار کر بے شمار عاشقین و محبین کو چھوڑ کر اپنے محبوب حقیقی سے جاملے، آپکے مختصر حالات جنھیں احقر نے جامعہ عربیہ ہتھورا کے دو سالہ زمانہ طالبعلمی میں دیکھا وہ ہدیۂ ناظرین ہیں

احقر کو حضرت والا کی زیارت کا شرف اشرف المدارس ہردوئی کے زمانہ طالبعلمی میں ہوا، حضرت والا کو حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم سے گہرا

ربط، بے پناہ تعلق اور محبت تھی، بعد نماز عشاء طلبہ کی ایک بھیڑ دیکھی، پہونچنے پر پتہ چلا کہ دقت کے ولی کامل حضرت قاری صاحبؒ تشریف فرما ہیں، طلبہ مصافحہ کا شرف حاصل کر رہے ہیں، حضرت والا دفتر کے سامنے چبوترے پر بیٹھ گئے حضرت ہردوئی کو اطلاع ہوئی اندر سے کسی کے نکلنے کی آہٹ محسوس ہوئی، تو حضرت والا ادباً کھڑے ہو گئے اور طلبہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیے حضرت تشریف لا رہے ہیں، حضرت والا تشریف لائے، دونوں بزرگوں کے لبوں پر تبسم خندہ پیشانی اور اخلاص وللہیت کے ساتھ مصافحہ ومعانقہ کا منظر دیکھ کر طلبہ بیحد مسرور تھے۔

دوسری ملاقات بھی ہردوئی میں ہوئی ۱۹۸۳ء کی بات ہے جبکہ ملک کے مشاہیر بزرگان دین حضرت مفتی اعظم ہند مولانا محمود حسن صاحب گنگوہیؒ، مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھیؒ اور مولانا حکیم محمد اختر صاحب مدظلہ (کراچی، پاکستان) ودیگر اکابر علماء سرزمین ہردوئی پر جلوہ افروز تھے، مجالس میں ان کے بیانات ہوتے، حضرت مفتی صاحبؒ کی مجلس میں حضرت ہردوئی فرش پر طالب علم کی طرح انتہائی ادب واحترام کیساتھ ایک پیر پہ بیٹھتے تھے، گویا علم ومعرفت اور عشق رسولؐ کا دریا موجزن تھا، راقم الحروف نے اولیاء اللہ کے اجتماع کا ایسا حسین دپرکیف منظر ابتک نہ دیکھا تھا، خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت مفتی صاحبؒ اور حضرت پرتاب گڈھیؒ کی واپسی کے بعد شام کو حضرت قاری صاحب فرط محبت اور شوق زیارت میں جلوہ افروز ہوئے (غالباً حضرت قاری صاحبؒ کو پروگرام کی اطلاع نہ تھی) اور جس شخصیت کی کمی کا احساس تھا اس کے دیدار ومصافحہ کا شرف بھی حاصل ہو گیا، حضرتؒ کے نورانی بیان سے لوگ مستفیض ہوئے، اس مجلس کے فیوض وبرکات کچھ اس طرح محسوس ہو رہے تھے

رشک کرتا ہے فلک ایسی زمین پر اسعد
جس پہ دو چار گھڑی ذکر خدا ہوتا ہے

محترم جناب کامل الہ آبادی صاحب دامت برکاتہم بھی تشریف فرما تھے اور اکابر کی مجلس و اجتماع کا منظر اپنی اس مختصر سی نظم میں پیش کیا تھا جو اب تک راقم الحروف کی کاپی میں محفوظ ہے ۔

کتنی روشن آج کی ہے انجمن	کیوں نہ ایسے میں چلے دور سخن
نور حق سے جنکے دل معمور ہیں	وہ یہاں پر آج ہیں جلوہ فگن
شیخ دوراں شاہ ہردوئی ادھر	اور ادھر محبوب شاہ ذو المنن
زینت چرخ بریں اختر بھی آج	فرش پر آکر بنے زیب چمن
لائے ہیں کامل یہاں تشریف آج	مفتی دیں شاہ محمود الحسن ؒ

حضرت باندوی ؒ کے ورود مسعود پر کامل صاحب کی نظم نامکمل سی لگنے لگی اسی وقت احقر کے ذہن میں یہ الفاظ وارد ہوئے تھے

درد عالم کا لئے صدیق بھی باغ ہردوئی میں ہیں جلوہ فگن

جامعہ عربیہ ہتھورا میں حضرت کے زیر سایہ رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا داعیہ اور شوق پیدا ہوا، اُدھر مشفق الامۃ محی السنۃ حضرت ہردوئی کی جدائی کا غم، آخر کار قادر مطلق نے شوال میں ہتھورا پہونچا ہی دیا۔

درس و تدریس

حضرت والا فرماتے کہ آجکل اساتذہ کا عجیب حال ہو گیا ہے، دو چار گھنٹہ پڑھا کر تھک جاتے ہیں میں نے ایک ایک دن میں ۲۰، ۲۰ اسباق پڑھائے ہیں، حضرت والا طلبہ کے اسباق کا بہت خیال فرماتے حتی الامکان ناغہ نہ ہوتا سفر سے آتے جاتے سبق ضرور پڑھاتے، ایک سفر سے واپسی ہوئی چہرہ پر سفر کے آثار آنکھیں سُرخ طبیعت

بھی مضمحل، لیکن سبق پڑھایا۔

افریقہ کے ایک طالب علم بیمار تھے، جنکا کمرہ کچھ فاصلے پر بالائی منزل پر تھا حضرت والا انکے کمرے میں جاکر سبق پڑھاتے، اگر کوئی استاذ دو چار یوم کی رخصت پر ہوتے تو انکے اسباق بھی پڑھاتے، اور شعبۂ حفظ و پرائمری کے درجات میں جاکر اسباق سنتے اور امتحانات کے موقعہ پر امتحان بھی لیتے، دوران سبق ہمیشہ نصیحت آموز کلمات سے نوازتے۔

طلبہ پر شفقت

حضرت والا طلبہ کے ساتھ شفقت و محبّت کا معاملہ فرماتے کسی طالبعلم کے سخت بیمار ہونیکی اطلاع ملتی تو حضرت خود عیادت فرماتے، اور برائے علاج اس کا تعاون بھی فرماتے، حضرت والا فرماتے یہ طلبہ پردیسی ہیں، مہمان رسولؐ ہیں، ہماری نگرانی میں ہیں اب اگر ہم انکی دیکھ بھال نہ کریں تو یہ بیچارے کہاں جائیں گے، حضرت بڑے رقیق القلب تھے طلبہ کے حالات سے متأثر ہوکر آبدیدہ ہوجاتے تھے۔

صوبہ بہار کے حافظ آفتاب عالم متعلم درجۂ ہفتم جنکی بینائی کافی کمزور تھی، بموقعہ امتحان سہ ماہی بغرض مطالعۂ کتب چھت پر گئے، پیر پھسلا، نیچے گرنے کی وجہ سے شدید چوٹ آئی، آخر کار دو یوم کے بعد باندہ اسپتال میں انکا انتقال ہوگیا، حضرت والا سفر میں تھے، بذریعہ فون مدرسہ پر آنے کی درخواست کی گئی، حضرت تشریف لائے، حادثہ کی اطلاع پاکر زار وقطار رونے لگے، حضرت کے اس دلی صدمہ کا اثر طلبہ پر بھی ہوا، حضرت غم سے بالکل نڈھال تھے، حضرت والا نے نماز جنازہ پڑھائی اور سلام پھیرتے وقت بھی آواز گلے میں پھنس گئی۔

حضرت کسی طالب علم کو ڈانٹتے تو فوراً مسکرانے لگتے، ایک طالب علم کے بال بہت بڑے تھے، بعد عصر مسجد سے نکلتے ہوئے نگاہ پڑگئی، جلال میں آکر بالوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "یہ بال، یہ بال! پڑھنے آئے ہو،

پڑھنے آئے ہو"؟ اس طالب علم نے گھبراکر عرض کیا "گھر سے پیسے نہیں آئے" حضرت کا سارا غصہ کافور ہوگیا، مسکرائے، پھر اسے دیکھ کر آنکھیں اشکبار ہوگئیں، اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف لے گئے، اور کچھ روپے عنایت فرمائے۔

ایک طالب علم بڑی شرارتیں کرتا، طلبہ بھی اسکی حرکت سے پریشان، حضرت کے پاس بار بار شکایت گئی، کانپور سے آئے ہوئے مہمان کی بارہ دری کار پر مع بستر کے بٹھاکر ہدایت فرمائی کہ اس کا گھر فلاں جگہ ہے، اسکے والدین کے حوالہ کردیں وہ طالب علم دوسرے روز ہی بستر لیکر حضرت کے کمرے کے سامنے پہونچا، حضرت والا نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا "چلو پڑھو، شرارت مت کرنا۔

ایک طالب علم کا اخراج کردیا، وہ طالب علم سامان لیکر گھر جانے لگا حضرت کو اطلاع ملی بے چین ہوگئے، بلوایا اور فرمایا "ذرا سا ڈانٹ دیا گھر چلدئے! اللہ کے بندے اپنی حالت نہیں بدل سکتے؟ پھر داخلہ ہوگیا۔

غیروں کا خیال

مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہتا، آئے دن طرح طرح کے مریض بھی پہونچتے، علاقے کے امیر و غریب غیر مسلین بھی کافی تعداد میں دعاؤں کیلئے پہونچتے، کوئی پیروں پر گرتا، حضرت منع فرماتے، کوئی حضرت کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگتا، باندہ سے آنے والی بس کے کنڈکٹر، ڈرائیور، سواریاں اتار کر بے تکلف حضرت کی خدمت میں پہونچتے، حضرت اپنا دستِ شفقت انکے سروں پر پھیرتے ہوئے مسکراکر حالات معلوم کرتے، ان سب کی ضروریات پوری کرنے کے بعد فرماتے "چلو کھانا کھالو" انکار کرتے، لیکن حضرت دال روٹی ضرور کھلا دیتے، بیچارے دیہاتی امیر و غریب مسلم و غیر مسلم سب حضرت کے دسترخوان سے مستفید ہوکر آپکے اخلاق کریمانہ سے بے حد متاثر ہوتے۔

.... بدل جاتی ہیں تقدیریں

آستانۂ صدیقی پر آکر نہ جانے کتنے قاتلوں رہزنوں، شرابیوں کی زندگیوں میں انقلاب آگیا، انکی قسمت کی کایا پلٹ گئی اور وہ حضرت کے سچے معتقد ہو گئے ۔

جامعہ عربیہ کے استاذ جناب صوفی اظہار احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ جمن نامی ایک بدمعاش تھا جس سے لوگ کانپتے تھے، کبھی کبھار حضرت سے ملاقات بھی کرتا، حضرت کا سفر تھا، باندہ ریلوے اسٹیشن پر گاڑی پر سوار ہوئے، جمن پر نگاہ پڑی، وہ شراب پی کر نشے میں چور تھا، حضرت نے اپنے خادم کو بھیجکر بلوایا، خادم نے جاکر کہا چلو بابا بلا رہے ہیں، اس نے کہا ہتھوڑا والے بابا؟ وہ گھبرا گیا، دو گلاس لسی لیکر پہونچا، حضرت کے سامنے پیش کر دیا حضرت نے ایک گلاس خادم کو دیکر خود پینے سے انکار کر دیا، جمن کے بار بار اصرار پر ایک گھونٹ پی کر جمن کو دیدیا، اس نے پی لیا، خدا نے اس لعاب دہن میں ایسی تاثیر پیدا کر دی جس سے وہ تائب ہو کر صوم وصلاۃ کا پابند ہو گیا ۔

مرغوب غذا

آپکو مرغن کھانا کم پسند تھا، سادہ کھانا، سبزی دال چٹنی، اچار ساگ وغیرہ زیادہ پسند فرماتے، دسترخوان پر اگر متنوع اقسام کے ماکولات ہوتے تو آپ چٹنی، اچار، دال، بڑی رغبت سے تناول فرماتے بارہا مشاہدہ ہوا کہ حضرت دور دراز کے سفر سے واپس تشریف لاتے ہی پڑھانے بیٹھ گئے صاحبزادہ محترم مولانا حبیب احمد صاحب ناشتہ دان میں کھانا لیکر آئے، قدرے توقف فرماکر حضرت والا دو چپاتی اور چٹنی کھاکر دال پی گئے ۔

عبرتناک واقعات

حضرت کے ابتدائی حالات بڑے عبرتناک اور سبق آموز ہیں، جو بعض رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، دوران سبق ایک مہمان آئے، اور حسب قاعدہ چلنے کی درخواست کرتے

ہوئے کہا حضرت گاڑی لیکر آیا ہوں، مہمان کو مہمان خانہ میں بھیج دیا، اور آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنی قدیم داستانِ غم سناتے ہوئے فرمایا: آج گاڑی آئی ہے کل ہماری جیب میں کرایہ تک نہ رہتا تھا، طلبہ کے خورد و نوش کا انتظام حضرت کے ذمہ تھا، اکثر باندہ پیدل جانے کا اتفاق ہوتا، کرایہ ہوتا تو بس پر بیٹھ جاتے، ورنہ پیدل ہی سفر ہوتا، باندہ سے ہتھورا سولہ کلو میٹر ہے، بس والے روک کر بس پر بٹھا لیتے، کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے بڑی شرمندگی محسوس ہوتی، حضرت فرماتے تھے کہ جب کوئی بس آتی تو میں کسی بہانے سے روڈ کے کنارے بیٹھ جاتا، بس نکلنے کے بعد اپنا پیدل سفر شروع ہو جاتا۔

فرمایا ایک جلسہ میں جانا ہوا، جاتے وقت وہاں کے ایک صاحب ساتھ تھے، جنھوں نے مصارف سفر برداشت کئے، واپسی پر مجھے بس پر بٹھا دیا، کرایہ تک نہ دیا، میری جیب میں بہت ہی مختصر سی رقم تھی ٹکٹ لیا، اور بدرجہ مجبوری اگلے اسٹیشن پر اترنا پڑا، میرے جھولے میں ایک مستعمل نئی لنگی تھی جسے ایک دوکاندار کے ہاتھ بہت کم پیسوں میں فروخت کر کے کسی طرح مدرسہ پر پہونچا۔

بس مالکان کی تمنا

حضرت کی شہرت ہوئی لوگ جوق در جوق پروانہ وار آنے لگے، باندہ کے بس مالکان کی جانب سے ڈرائیوروں کو ہدایت تھی کہ بابا کا ہر طرح خیال کیا جائے، باندہ سے ہتھورا جانے کیلئے قصبہ "بسرد" جانیوالی بسیں ملتی ہیں، نومیل اسٹیشن اتر کر ہتھورا کیلئے ایک کلو میٹر پیدل چلنا پڑتا ہے، اب تو دو تین تانگے بھی چلنے لگے ہیں، حضرت جس گاڑی پر بیٹھتے ڈرائیور اپنی خوش قسمتی سمجھ کر بے حد مسرور ہوتا، اور ہر طرح کا ادب و احترام بجا لاتا، اور نومیل اتارنے کے بجائے ہتھورا پہونچانے کی کوشش کرتا، لیکن حضرت اسٹیشن آنے سے پہلے ہی کھڑے ہو کر آواز دیتے "مہربان روک دو!

مجھے یہیں اترنا ہے" ڈرائیور سننے کے باوجود مسکراتے ہوئے گاڑی موڑ کر مدرسہ تک پہونچا کر ہی سانس لیتے۔

حضرت مدرسہ آنے کیلئے ایک بس پر بیٹھے تھے کہ دو پولیس والے آگئے وہ ایک ٹرک کے تعاقب میں تھے، جس پر کچھ ناجائز مال لدا ہوا تھا، وہ ڈرائیور پر تیز چلنے کیلئے زور ڈالتے رہے، ڈرائیور خوب تیز چلا یہانتک کہ وہ ٹرک نظر آنے لگی اور حضرت کی منزل بھی قریب آگئی، اب ڈرائیور کے سامنے دو مسائل تھے یا تو حضرت کو نومیل اتار کر ٹرک کا پیچھا کرتا، یا حضرت کو مدرسہ پہونچا کر پولیس والوں کو ناراض کرتا، اس نے حضرت کو مدرسہ تک پہونچانے کا فیصلہ کرلیا اور گاڑی موڑ دی، پولیس والے بہت ناراض ہوئے، لیکن اس نے کچھ پروا نہ کی، ڈرائیور نے پولیس والوں سے کہا: آپلوگ ٹرک کے چکر میں ہیں کچھ پتہ بھی ہے! وہ بھوراوالے بابا تھے جنکے آشرواد اور دعاؤں سے یہ بسیں چل رہی ہیں، ان کی تکلیف ہمیں ہرگز گوارا نہیں۔

جنگل میں منگل کیسے ہوا

تبلیغ دین واشاعت اسلام کا درد لیکر مدرسہ کی بنیاد رکھی، اور گاؤں گاؤں جاکر لوگوں کو قریب کیا، حضرت نے اپنے آپکو ایک خادم سے زیادہ کچھ تصور نہ کیا، لیکن عوام وخواص کی نگاہ میں آپ کی بڑی قدر ومنزلت تھی، ارشاد نبوی ہے "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ"۔

حضرت نے اس جنگل اور اسلام سے دور علاقہ اور ماحول میں کسی حکمت عملی اور دوراندیشی سے کام لیا، حضرت خود فرماتے کہ ابتداءً گاؤں گاؤں جاکر لوگوں سے ملاقاتیں کرکے دینی امور کی باتیں تبلاتا، شادی غمی میں برابر کا شریک ہوتا، ایک صاحب کی بھینس مرگئی، حضرت کو اطلاع ملی چلے گئے،

سخت دھوپ میں پہونچے، فرمایا: سنا ہے آپکی بھینس مرگئی بڑا صدمہ ہوا، اللہ تعالیٰ اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے، اس غایت درجہ الفت ومحبت کا اظہار فرماکر لوگوں کے قلوب کو جیت لیا، حضرت فرماتے تھے "میں نے انکی ہر خوشی غمی، شادی غمی میں شریک ہوکر انکو قریب کیا ہے"۔

خدمتِ مریض حضرت والا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حتی الامکان لوگوں کی عیادت بھی کرتے، باندہ شہر کے ایک مؤذن صاحب جن کے حضرت سے تعلقات تھے، بیمار ہوگئے، مرض بڑھتا گیا، ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا، حضرت انھیں ہتھورا مدرسہ پر لے آئے، علاج چلتا رہا دست کی شکایت بھی پیدا ہوگئی، ۱ بجے شب میں احقر استنجا کیلئے بیدار ہوا تو دیکھا کہ حضرت والا مؤذن صاحب کے کپڑے دھل رہے ہیں، احقر نے کپڑے دھلنے کیلئے ہاتھ بڑھایا، تو حضرت نے فرمایا تم نل چلاؤ میں دھل رہا ہوں لیکن اصرار پر کپڑے دے دئے، اور خود مؤذن صاحب کے پاس چلے گئے، پھر مؤذن صاحب کی دیکھ بھال کیلئے طلبہ کی باری لگادی گئی، دو تین یوم کے بعد مؤذن صاحب دس بجے شب میں سیکڑوں طلبہ اور اساتذہ کی موجودگی میں دعائیں لیتے ہوئے اس دارفانی سے رخصت ہوئے، اور ہتھورا کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

حضرت ہردوئی کی آمد پر حضرت والا کی درخواست پر محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم نے قدوم میمنت لزوم رنجا فرماکر سرزمین ہتھورا کو زینت بخشی، طلبہ واساتذہ بصد شوق واحترام حضرت کی زیارت کے شدت سے منتظر تھے، تقریباً ۷ بجے شام کو حضرت مدرسہ پر پہونچے، حضرت قاری صاحب نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے طلبہ کو دور رہنے کی ہدایت فرمائی، بعد نماز عشاء طلبہ

واساتذہ سے مصافحہ ہوا، ذیل میں عربی درجات کی تمام درسگاہوں میں جاکر معائنہ فرمایا، کتابیں سنیں اور نصیحت فرمائی، اساتذہ کی ایک مجلس ہوئی جس میں سب کا قرآن کریم سنا، اور بعد نماز مغرب پھر ایک مجلس ہوئی جس میں اوّلاً حضرت ہردوئیؒ نے تلاوت فرمائی، پھر حضرت والا اور دیگر اساتذہ نے قرآن کریم سنایا، اور حضرت ہردوئیؒ نے سب کو پانچ پانچ روپئے انعام دئے۔

دوسرے روز بعد نماز عصر مہمان خانہ کے سامنے مجلس ہوئی، حضرت ہردوئی تخت پر جلوہ افروز تھے، حضرت قاری صاحب تشریف لائے تو حضرت ہردوئیؒ نے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "حضرت یہاں تشریف لائیں" لیکن حضرت تواضع و انکساری اور غایت درجہ ادب واحترام کی وجہ سے سامعین کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئے، حضرت ہردوئیؒ نے تبسم فرماتے ہوئے کہا "ہاں بھائی ترازو میں وزنی چیز کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور ہلکی چیز کا پلہ اوپر چلا جاتا ہے" حاضرین مجلس دونوں بزرگوں کے تعلق و محبت کا منظر دیکھ کر بیحد محظوظ ہو رہے تھے۔

دلچسپ واقعہ حضرت ہردوئیؒ کے خلیفہ و مجاز بیعت مشہور و معروف بزرگ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب (مقیم حال کراچی پاکستان) تشریف لانے والے تھے، حضرت والا ہم طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے، محترم جناب مولانا حبیب احمد صاحب کو بلاکر فرمایا، آج حکیم صاحب تشریف لا رہے ہیں، ایک مرغے کا انتظام کرلو! یہ کہہ کر جیب سے دو روپئے نکال کر دئیے، صاحبزادے نے عرض کیا، ابّا! مرغا دو روپئے میں نہیں ملے گا، ۲۵ روپئے لگیں گے، حضرت نے بڑے تعجب سے فرمایا ۲۵ روپئے! پھر فرمایا بعد میں ملنا، غالباً حضرت کی جیب میں اسوقت دو ہی روپئے تھے، اور مرغا کی قیمت بھی معلوم نہ تھی۔

نکاح میں شرکت سے انکار راقم الحروف کو ۱۹۸۷ء سے دارالعلوم الاسلامیہ

میں تدریسی خدمات انجام دینے کی سعادت حاصل ہونے کے بعد حضرت سے کئی بار ملاقات ہوئی، حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب دامت برکاتہم کے حکم پر احقر کو مادر علمی جامعہ عربیہ ہتھورا جانے کا موقع ملا، دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے ناظم تعمیرات مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی ساتھ تھے، حضرت سے ملاقات ہوئی خط پیش کیا، اور سارے کام ہو گئے، صبح واپسی کا پروگرام تھا، حضرت والا باندہ شہر میں خواندگی نکاح کیلئے مدعو تھے، اور صبح حضرت کا سفر بھی تھا، حضرت کے حکم پر ساتھ میں باندہ جامع مسجد پہونچے، چند اساتذۂ کرام بھی ساتھ تھے، وہاں سے داعی کا مکان نظر آرہا تھا جہاں سجاوٹ کیلئے ہر طرح کے تکلفات کئے گئے تھے، حضرت نے کسی استاذ کو حالات کا جائزہ لینے کیلئے بھیجا، انھوں نے آکر بتایا کہ: سارا انتظام غیر شرعی ہے، حضرت نے نکاح میں شرکت سے انکار فرمادیا، لوگوں نے بہت اصرار کیا لیکن حضرت تیار نہ ہوئے، بدرجۂ مجبوری احقر سے فرمایا: تم جاکر نکاح پڑھادو احقر حکم کی تعمیل میں اپنے رفیق سفر کو لیکر گیا، دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اچھا ہوا حضرت تشریف نہ لائے، اسباب جہیز اور بچی کے کپڑے وزیورات کی نمائش لگی تھی، دوکانوں کی طرح سجایا گیا تھا، احقر نکاح پڑھا کر جامع مسجد پہونچا حضرت نے مزید تفصیلات معلوم کر کے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ایسی غیر شرعی مجلسوں میں شرکت سے اجتناب کرنا چاہئے، تم کو میں نے بدرجۂ مجبوری بھیج دیا تھا۔

حضرت والا جامع مسجد کے صحن میں ایک چٹائی پر لنگی بچھا کر لیٹ گئے، کچھ دیر خدمت کے بعد ہم لوگ بھی سو گئے، ڈھائی تین بجے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ حضرت تہجد میں مشغول ہیں، اپنی نماز فجر پڑھکر حضرت والا کے ساتھ روڈویز پہونچے حضرت نے ہم لوگوں کو کانپور والی بس پر بیٹھا کر اپنا سفر جاری فرمایا۔

حضرت کے یہ واقعات ہم سب کیلئے مشعل راہ ہیں، خداوند قدوس حضرت والا کے درجات بلند فرمائے، اور جامعہ عربیہ کو مزید ترقیات سے نوازتے ہوئے ہر طرح کے شر و فتن سے محفوظ فرمائے، اور تمام لوگوں میں صدیقی جذبۂ اخلاص وللہیت پیدا فرمائے۔ آمین

صفحہ ۲۰۱ کا بقیہ

نہیں، جبکہ ندائے غیب کب سے آرہی ہے کہ:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں

حضرت مولانا قاری سیّد صدّیق احمد باندوی رح

از: مولانا علاؤ الدین قاسمی
استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

حضرت مولانا قاری سیّد صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ کو اللہ تعالیٰ نے بہت ساری خوبیوں کا مالک بنایا تھا، حضرت مرجع خلائق تھے، بلا تفریق مذہب وملت ہر شخص آپ کا شیدائی تھا، اسکی وجہ یہ تھی کہ آپ کا ہر فعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ہوتا تھا جسکی وجہ سے اللہ نے آپکو ہر خاص وعام کے درمیان مقبول فرمایا، آپ جہاں بھی جاتے تھے ایک بھیڑ اکٹھا ہو جاتی تھی، کوئی دُعا کے لئے آرہا ہے، کوئی جھگڑے کا فیصلہ کرانے آرہا ہے، الغرض آپ ہر مرض کا علاج کرتے تھے، اور ہر شخص آپ کی بات ماننے کیلئے تیار رہتا تھا، جب بھی آپ کسی سے ملتے تو نہایت ہی محبت اور خلوص سے ملتے، اسی وجہ سے ہر شخص یہ تصوّر قائم کرلیتا تھا کہ حضرت مجھ کو بہت مانتے ہیں۔

ویسے تو حضرت کے سلسلہ میں ماشاء اللہ بہت سارے مضامین آچکے ہیں لکھنے والوں نے خوب لکھا، اور بالکل صحیح لکھا ہے اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی، مگر احقر نے حضرت رح سے پڑھا ہے، اور قریب رہ کر بہت ساری

چیزیں دیکھنے کو ملی ہیں، بار بار طبیعت کہتی کہ کچھ لکھوں مگر جب یہ دیکھتا کہ بڑوں نے بہت کچھ لکھدیا ہے جس میں حضرت کی پوری سوانح آگئی، تو اب اسکی ضرورت نہیں، مگر حضرت کی محبت و شفقت نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا، دراصل حضرت کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں، چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

حضرتؒ ایک باکمال مدرّس تھے

پڑھنے پڑھانے کا اتنا شوق تھا کہ صبح سے لیکر شام تک پڑھاتے رہتے تھے، آپ سے متعلق جو کتابیں تھیں مثلاً شرح جامی، جلالین، مختصر المعانی، بخاری شریف وغیرہ یہ تو پڑھاتے ہی تھے؛ اور اگر کوئی مدرّس غیر حاضر ہوتا، تو اس کی بھی کتابیں پڑھاتے تھے تاکہ طلباء کا نقصان نہ ہو، اور آپ کے اندر ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی کتاب بغیر وضو کے نہیں پڑھاتے تھے، اپنی آنکھوں سے بارہا دیکھا کہ جب کوئی کتاب اٹھاتے تو رومال سے پکڑتے، کتابوں کا حد درجہ احترام کرتے تھے، اور پڑھانے کا انداز بالکل سادہ تھا پیچیدہ اور مشکل عبارتوں کو چٹکیوں میں حل کرتے تھے۔

حضرت سفر بھی بہت کرتے تھے، مگر طلباء کا نقصان نہیں ہوتا تھا، ایک دن میں دُو دُو دن کا سبق پڑھا دیتے تھے، اور جب سفر سے تشریف لاتے تو فوراً سبق کی فکر فرماتے، اور مدرسہ کے حالات پوچھتے۔

پڑھانے کی عجیب وغریب دھن سوار رہتی تھی، تعمیر کا کام چل رہا ہے، اس کام کو بھی دیکھ رہے ہیں، اور وہیں طلباء کو بھی بلالیا، بالو کا ڈھیر لگا ہوا ہے اسی پر بیٹھ گئے، اور پڑھانے میں مصروف ہو گئے، کبھی کبھی تو تہجد ہی کے وقت پڑھا دیتے۔

ایک مرتبہ حضرت کو سفر کرنا تھا فجر کے بعد ہی شعبۂ افتاء کے طلباء کو بلالیا، کمرہ

میں لائٹ نہ ہونیکی وجہ سے اندھیرا تھا، تو حضرت نے کتاب کو روشندان کے سامنے کیا، اور کھڑے کھڑے پڑھانا شروع کر دیا۔ طلبار بھی کھڑے رہے، حضرت نے طلباء سے کہا کہ بھائی تم لوگ بیٹھ جاؤ میں کھڑے ہو کر پڑھا دوں گا، مگر طلباء نے بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا، اور کھڑے کھڑے پڑھتے رہے۔

الغرض کوئی بھی کام ہو حضرت سبق پڑھانے میں ناغہ نہیں کرتے تھے، اساتذہ کو بھی حکم دیتے تھے کہ پڑھانے میں ناغہ نہ کریں، اس سے طلبار کا نقصان ہوتا ہے، حضرت کے یہاں آرام نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

طلباء کے ساتھ شفقت

طلباء کے ساتھ حضرت شفقت کا معاملہ کرتے تھے، کبھی کسی طالب علم کیساتھ ایسا سلوک روا نہیں رکھتے تھے، جس سے اسکی دل آزاری ہو، مگر غلطی پر متنبہ کرتے، اور ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے، جب بھی کوئی طالب علم کسی کام کیلئے حاضر ہوتا فوراً اس کا کام کر دیتے، اور جب کوئی بیمار ہوتا تو اس کے علاج کی فکر کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ کھانے کی فکر فرماتے، پھل وغیرہ کا انتظام کر کے طالب علم کے کمرہ میں بھجدیتے تھے، کبھی اپنے گھر سے دلیا بنوا کر بھیجتے، اس طرح کا معاملہ ناچیز کیساتھ بھی حضرت نے فرمایا ہے، اور دوسروں کے ساتھ تو یہ طرز عمل بارہا دیکھا ہے۔

حضرتؒ کا حسن انتظام

اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر انتظامی امور کی بھی خوب صلاحیت رکھی تھی، اس کی سب سے بڑی دلیل "جامعہ عربیہ" ہے کہ تھوڑے سے عرصہ میں دین کا اتنا بڑا قلعہ بنا کر چھوڑ گئے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جامعہ میں مختلف شعبہ جات ہیں، لیکن سب کے ذمہ دار اصلاً حضرت ہی تھے، بیک وقت ساری چیزوں پر نگاہ رکھتے تھے، چاہے

درس وتدریس کا مسئلہ ہو، یا طلباء کا معاملہ یا تعمیر کا ساری چیزوں کو دیکھتے تھے، اور ہر کام آسانی سے ہو جاتا تھا، نہ معلوم کتنے مدرسوں کے آپ ذمہ دار اور سرپرست تھے اور ہر جگہ جاکر معائنہ بھی فرماتے اور لوگوں کے مسائل کو حل کرتے تھے۔

مہمان نوازی

حضرت کے یہاں ہر وقت مہمانوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی تھی، دعا تعویذ والوں کی الگ بھیڑ ہوتی تھی، جیسے ہی پڑھا کر فارغ ہوئے فوراً تعویذ وغیرہ میں مشغول ہو جاتے انکو رخصت کرکے مہمانوں کی فکر فرماتے، کس نے کھانا کھایا، یا نہیں کھایا برابر خادموں سے پوچھتے رہتے حضرت کی ایک خاص عادت تھی کہ جب بھی کوئی پہنچتا تو سب سے پہلے کھانے کی فکر فرماتے اور انکی ضرورتوں کو پوچھتے، حضرت کیلئے جب کوئی ہدیہ لاتا اگر کھانے کی چیز ہوتی تو اسکو مہمانوں کیلئے رکھ دیتے اور اسکو مہمانوں کے دسترخوان پر بھجوا دیتے اپنے کھانے کی فکر نہیں فرماتے، اور نہ ہی حضرت کے کھانے کا کوئی وقت تھا، جب بھی وقت ملا خشک روٹی نکال اور کھانا شروع کر دیا۔

ایک مرتبہ سبق پڑھا کر فارغ ہوئے، تو خشک روٹی کھانے لگے، اور فرمایا کہ تم لوگ بھی خشک روٹی کھایا کرو اس سے ذہن بڑھتا ہے، بہرکیف آپ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ کے صحیح مصداق تھے۔

حضرتؒ صاحب کرامت اور مستجاب الدعوات تھے

لکھنے والوں نے حضرتؒ کی کرامت کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، ناچیز نے بھی جامعہ میں اپنی آنکھوں سے عجیب وغریب کرامت دیکھی ہے، جامعہ میں تعمیر کا کام چل رہا تھا، چھت لگنے والی تھی، اینٹیں بچھا دی گئی تھیں، مگر سلیب نہیں پڑی تھی، رات میں بارش ہونے لگی حضرت فوراً کمرے سے نکلے، اس وقت چہرہ بالکل سرخ تھا، اور کافی پریشان

تھے، حضرت کو یہ فکر تھی کہ کافی نقصان ہو جائے گا، آپ کے پیچھے اساتذہ اور طلبہ بھی دوڑ پڑے، اینٹوں پر ترپال وغیرہ بچھانا شروع کیا، اور حضرت ایک کنارے رومال بچھا کر نماز میں مشغول ہو گئے، اور اللہ سے دعا کرنی شروع کی بارش کم ہو گئی، مدرسے کے پیچھے تھوڑی دور پر ایک گاؤں ہے، وہاں خوب بارش ہوئی، مگر اللہ کے فضل وکرم سے یہاں بارش نہیں ہوئی، اور کوئی خاص نقصان نہیں ہوا، دوسرے دن چھت ڈال گئی۔

ویسے تو لکھنے کو بہت کچھ ہے، مگر جو کچھ دیکھا گیا اسکو قلمبند کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ حضرت کی قبر کو نور سے بھر دے، اور جنت الفردوس میں داخل فرمائے

آمین

شاگردوں پر شفقت

استاذ کو چاہیئے کہ شاگردوں پر شفقت کرے، اور انکو اپنے بیٹوں کے برابر جانے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِہٖ میں تمہارے لئے ایسا ہوں جیسا کہ والد اپنے لڑکے کیلئے۔

(از: عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ)

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں!

مولوی محمد اسجد قاسمی بستوی
متخصص فی الادب ـــــ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ایک عرب شاعر نے کہا ہے کہ موت اندھی ہوتی ہے جسکو پاجاتی ہے دبوچ لیتی ہے، اور جسکو چھوڑ دیتی ہے اسے کھوسٹ اور ناکارہ بنادیتی ہے، مگر ایک دوسرے شاعر نے بڑی برموقعہ تاویل کی ہے گو دل کا داغ کسی تاویل سے دھویا نہیں جاسکتا موت کے میدان میں صبر کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اسلئے کہ ابدی زندگی کسی کے بس میں نہیں ہے

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا ٭ آدمی بلبلا ہے پانی کا

زمین چمن گل کھلائے یا نہ کھلائے، لیکن اس کے سینہ میں جانے کتنے گوہر ہائے نایاب اور گنجہائے گرانمایہ آسودۂ خاک ہیں، علم وعمل کے موتی، فکر و نظر کے ستارے ادب وفن کے شہسوار، اور تاریخ کے یگانۂ روزگار سبھی اس کی آغوش میں دفن ہیں مگر ــــ ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں!

اِس دل گداز خبر پر اگرچہ ایک عرصہ بیت چکا کہ برصغیر ہند و پاک میں سلف کی

یادگار عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ ہم سب کو داغِ مفارقت دے گئے، لیکن اس ہوشربا سانحہ کی ٹیس نہ جانے کبتک دلوں میں تازہ رہے گی کہ یہ صرف کسی ایک شخص کی وفات نہیں، بلکہ ایک پورے عہد کا، اس کے مزاج و مذاق کا اور اسکی دلآویز خصوصیات کا خاتمہ ہے ؎

وَمَاکَانَ قیسٌ هُلْکُهٗ هُلْكُ وَاحِدٍ ۔۔ وَلٰکِنَّهٗ بُنْیَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

کچھ زندگیاں تو وہ ہوتی ہیں کہ انکے باقی رہنے کی خوشی نہ کسی کو انکے جانیکا غم۔ مگر کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہزاروں، لاکھوں انسان ان سے فیضیاب ہوتے ہیں، انکے جانے سے بیشمار امیدوں اور آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے، انھیں دنیا والے تو روتے ہی ہیں، قرآن شاہد ہے کہ ان پر آسمان و زمین بھی آنسو بہاتے ہیں اور یہ حقیقت ہے جیسا کہ عرب شاعر نے کہا ہے وَلَیسَ لِعَینٍ لم یفض مَاءهَا عذر کہ ایسے روح فرسا حادثات پر جو آنکھ آنسو بہا نہ سکے اس کا عذر قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ایسی عبقری نادرۂ روزگار شخصیات کے جانے سے رونقِ محفل ختم ہو جاتی ہے چارسو ہو کا عالم اور سناٹا طاری ہو جاتا ہے، اور سب پر اداسی چھا جاتی ہے ؎

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
وہ کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

حضرت قاری صاحب مرحوم بلاشبہ ان شخصیات میں سے تھے، جو زمانہ کے سپرد نہیں ہوتے، بلکہ جن کے سپرد سارا زمانہ ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں سب سے زیادہ محبوبیت، ہر دلعزیزی، قبولِ تام اور رجوعِ عام بلا تفریق مذہب و مسلک انھیں کو حاصل تھا، وہ خود ایک عہد تھے، عہد ساز اور عہد آفریں تھے ان جیسا شخص صدیوں میں پیدا ہوتا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ۔۔ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

انھوں نے اپنا آرام اسلئے تج دیا کہ ہماری بے آرامیاں ہمیں تھکا نہ دیں، اپنی راتیں جاگتے گذار دیں کہ ہمارے دلوں کی کالک دور ہو جائے، اپنے افکار و کردار سے چراغ روشن کئے کہ ہماری دنیا اندھی اور اندھیری نہ رہے، وہ جہاں ایک طرف راہِ حق میں عزیمت واستقامت کا پہاڑ تھے، وہیں رشد و ہدایت کا منارۂ بلند بھی، ان سے ہزار ہا بندگانِ خدا کو ایمان واستقامت کی دولت ملی، اور وہ الحاد اور تشکیک کے اندھیروں سے دینِ حق کی روشنی میں آ گئے، وہ جوانی سے لیکر زندگی کے آخری لمحے تک اسلام کی خدمت کیلئے وقف رہے، اسی راہ میں اپنے علم و عمل دل و دماغ، زبان و قلم بلکہ ساری قوتیں نچوڑ ڈالیں، اپنے شب و روز کا ہر لمحہ خلقِ خدا کو صراطِ مستقیم پر لانے کیلئے اس طرح صرف کیا کہ اسکا تصور کرنا بھی مشکل ہے

ع 	کس قدر بیباک روح اس ناتواں پیکر میں تھی

وہ مسندِ علم کی رونق اور محفلِ طریقت کی جان تھے، سلفِ صالحین کی چلتی پھرتی یادگار، مجسم زہد وایثار، پیکرِ تقدس، کوہِ استقامت جسے دیکھ کر ایمان کے بجھے ہوئے ذرات میں تازگی آتی تھی، اور جس کے قرب سے دلوں میں ذوقِ عمل اور تعلق باللہ کی امنگیں بیدار ہوتی تھیں، جسکی فنائیت وفدائیت، خلوص وتواضع، ایثار و بےنفسی کا اپنوں اور غیروں سبھی میں چرچا ہے، جنھوں نے خدمتِ دین کو اپنی اصل دولت سمجھا، یہ مبارک ہستی جو اپنے تعلق باللہ اور کیفیاتِ باطنی کو ایک راز کی طرح عمر بھر چھپاتی رہی، لیکن اسکا چہرہ اس راز کو ہر شخص پر فاش کر دیا کرتا تھا، اور اثر انداز ہوتا تھا مگر ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم، ذکاوت

صلاح وتقویٰ، ملّت کی اصلاح کیلئے درد وتڑپ اور اس کیلئے ہر طرح کی قربانی دینے کے حوصلہ وجذبہ میں انکی نظیر اسوقت بلادِ اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ؎

درمیانِ کارزارِ کفر ودین ٭ ترکشِ ما را خدنگِ آخرین

وہ انسانی بلندیوں کے اعلیٰ معیار پر تھے، اخلاص وبے غرضی انکی حیات کا جوہر اور انکے تمام اعمال ومساعی کا محرک تھا، ضیافت ومہمان نوازی انکی طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی، پھر مہمانوں کے ساتھ تواضع وانکساری اور اکرام واحترام مستزاد ؎

وَاِنّی لَعَبْدُ الضَّیْفِ مَادَامَ نَازِلاً

وَمَا شِیْمَۃٌ لِیْ غَیْرُھَا تُشْبِہُ الْعَبْدَا

ظاہری ٹیپ ٹاپ، تکلف وتصنع سے انتہا درجہ دور و بیزار تھے، سادگی ان کا وصفِ خاص تھا، ہزاروں مدارس انکی سرپرستی میں مصروفِ عمل تھے، اور ہزاروں انسان انکی نگاہِ التفات سے راہ یاب ہوتے تھے، ان کے رخصت ہو جانے کے بعد اب ہر طرف سکوت طاری ہے، اور ان جیسا مردِ درویش ومسیحا دور دور تک نظر نہیں آتا ؎ اتنی سنسان کبھی پہلے نہ تھی ہجر کی رات

دور تک قافلۂ صبح کے آثار نہیں

ملّتِ اسلامیہ ایک ایسی آفاقی اور فعال ترین شخصیت سے محروم ہوگئی جس کی نظر میں وسعت تھی، دماغ قافلہ سالاری کی پوری صلاحیت رکھتا تھا، جس کے دلوں میں تپش اور سینوں میں گداز تھا، پیشانی عبادت کیلئے وقف، اور دل سوز سے پُر تھا، جسکا اضطرابِ دروں اسکے چہرہ پر ہر وقت نمایاں رہتا تھا، مگر ہمیں یقین ہیکہ ؎ مرقد کا شبستان بھی اسے راس نہ آیا۔

آرام قلندر کو تہہِ خاک نہیں ہے

مدارس دینیہ کا قیام، علوم اسلامیہ اور سنت رسول کی ترویج ان کا خاص مقصد تھا جس کیلئے انھوں نے اپنی حیات مستعار کا بیشتر حصہ سفر میں گذارا، شب و روز کی انتھک محنتوں کے باوجود معمولات کی مکمل پابندی پھر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مستقل سلسلہ آخر تک جاری رہا، انکی ہمت و حوصلہ کا طائر بلند پرواز کسی بلند سے بلند شاخ پر بھی آشیانہ بنانیکے لئے تیار نہ ہوا، کوئی دور سے دور جگہ ان کو دور، اور کوئی مشکل سے مشکل کام انکو مشکل نہ معلوم ہوا، درس و تدریس، وعظ و ارشاد، بیعت و تلقین، علمی و فکری ذوق و اشتغال انکی فطرت کا جزء تھا، یہ سب کام بڑی طویل عمر چاہتے تھے مگر ؎

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ ؏ ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

انکے گرد پروانوں کا ہجوم خود انکی شخصیت کی مقبولیت و محبوبیت، بے نفسی و تواضع، خوش خلقی و خوش مزاجی کی سب سے بڑی دلیل ہے ؎

ہجوم کیوں ہے یہ واعظ شرابخانہ میں ؏ فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

انکی ذات والا صفات علم و عشق کا مجمع البحرین تھی، اور جو علم و عشق کا جامع ہوتا ہے، اس کے کارنامے لازوال و مؤثر ہوتے ہیں، اور وہ زندۂ جاوید رہتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

عالمانہ بصیرت، علمی جد و جہد، مقصد کی لگن، حق گوئی و بیباکی، خلوص و تواضع حکمت و تدبر، وسعت نظر، سنجیدگی و وقار، صلاح و تقویٰ، عبدیت و للّٰہیت کا پیکر تھے، چشم فلک نے پردۂ گیتی پر بے شمار شخصیات دیکھی ہیں، مگر حضرت قاری صاحبؒ جیسی شخصیت بہت کم دیکھنے میں آتی ہے ؎

رفتی و از رفتنت یک عالمے تاریک شد * تو مگر شمعے چون رفتی بزم برہم ساختی

ان کی وفات سے پورے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، ایک بساط تہہ ہو گئی، وہ اپنی ساری خصوصیات اپنے ساتھ لے گئے، اور اپنے پیچھے ایک مہیب خلا چھوڑ گئے، مگر ان کے کارنامے، خدمات، قربانیاں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گی، اقبال نے انھیں جیسے عبقری لوگوں کیلئے کہا تھا، اور شاید ان جیسے ارباب فضل وصلاح کے پیغام فکر وعمل کی ترجمانی اس سے بڑھ کر نہ ہو سکے

نہ تخت وتاج میں نے لشکر وسپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اچھی تربیت کا نتیجہ

(از: عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نوراللہ مرقدہٗ)

ایک زمانہ تھا اچھی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ہماری ماؤں اور بہنوں سے اولیاء اللہ پیدا ہوئے، ماں کا تربیت میں زیادہ دخل ہوتا ہے بمقابل باپ کے جیسی ماں ہوتی ہے ویسی اولاد ہوتی ہے، مائیں اگر صحیح ہوں تو انکی اولاد نیک اور صالح ہونگی اس واسطے ماں بہنوں سے گذارش ہے کہ اپنے اندر جو بھی ہنر انکے یہاں (یعنی اسکول کالج میں) پایا جاتا ہے، اسکو حاصل کریں کوئی منع نہیں ہے لیکن دین ہمارا مقدم ہے، دین کیساتھ ہمیں سب کچھ کرنا ہے، انگریزی تعلیم بھی بقدر ضرورت پردے کیساتھ دین کے دائرے میں رہ کر ہو، تو کون منع کرتا ہے، مگر جس تعلیم سے بے دینی آتی ہو بے حیائی بے پردگی آتی ہو اور ناجائز تعلقات ہوتے ہوں لعنت ہے ایسی تعلیم پر، ہمکو تو صرف تعلیم حاصل کرنا ہے، زبان سیکھنا ہے، دین تھوڑے ہی برباد کرنا ہے...

حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ

ایک عظیم روحانی شخصیت

از: مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ترجمہ: ــــــ مولوی محمد اسجد قاسمی بستوی۔ تخصص فی الادب۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۹۹۷ء جمعرات کا دن، چاشت کا وقت۔ اچانک یہ خبر دل ودماغ پر بجلی بن کر گری کہ عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی لکھنؤ کے ایک معروف نرسنگ ہوم میں خدا کو پیارے ہوگئے گویا۔ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔ حضرت قاری صاحبؒ کا ایک دن قبل بلڈ پریشر ہائی ہوگیا تھا، مگر علاج معالجہ کے باوجود طبیعت سنبھل نہ سکی مرض بڑھتے بڑھتے برین ہیمرج کی شکل اختیار کرگیا، ماہر اطباء اور ڈاکٹروں کی ساری تدبیریں، اور تمام طبی سہولتیں تقدیر الٰہی کے مبرم ومحکم فیصلہ کو نہ ٹال سکیں، اور سانحہ پیش آ ہی گیا ؎

مصائب اور تھے پر ان کا جانا عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

مولانا مرحوم کا شمار برِ صغیر ہند وپاک کے نابغۂ روزگار ربّانی علماء اور عظیم مصلحین ومربّیوں کی صفِ اول میں ہوتا تھا، مقبولیتِ عام ومرجعیت کا ایسا منظر بہت کم دیکھنے میں آتا ہے، جہاں وہ جاتے اور ٹھہرتے پروانے شمع

کے گرد ہر طرف سے جمع ہو جاتے، انکے دیدار، ایک کلمۂ خیر سننے اور دعاؤں کا ذخیرہ لینے کیلئے ایک ہجوم کشاں کشاں چلا آتا تھا، حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ دعوت دین، اصلاح امت، تربیت و تزکیہ کیلئے اسفار میں ہی گذرا، سفر کی تکان، پریشانی اور مشقت ان کیلئے مقصد کی اہمیت کے سامنے بے معنیٰ تھی، وقت و وعدہ کی پابندی و رعایت کا مکمل خیال غالب تھا، سفر خواہ کتنا ہی طویل و پرمشقت کیوں نہ ہو، آرام و راحت کا نام و نشان نہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اس عالم سعی و کوشش میں انسان کیلئے آرام نہیں۔ دعوت اسلام تعلیم و تربیت فرد و معاشرہ کو کتاب و سنت کی روشنی میں صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی تلقین تمام معاملات کے حل و اصلاح کی کوشش، امت میں سرایت کر جانیوالی اخلاقی کمزوریوں، بگاڑ، اور برائیوں کی وضاحت، ان سے بچنے اور دور رکھنے کی خواہش، یہ سب وہ بنیادی مقاصد ہیں، جن کے پیش نظر حضرت مرحوم شب و روز بلا توقف مسلسل سفر کرتے جاتے تھے، اور اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں تاخیر کوتاہی، اور دریغ بالکل نہیں کرتے تھے، تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تربیت ہی کے مقصد سے حضرت نے ضلع باندہ کے ایک دور افتادہ گاؤں ہتھورا میں ایک بڑے اسلامی قلعہ اور دینی مرکز کی بنیاد رکھی، بتوفیق ایزدی یہ مقاصد بڑی حد تک پورے ہوئے، اور اس ادارہ کے پروگرام وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے، پھر تشنگان علوم نبوی کا ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے رجوع عام اور کافی بڑی تعداد میں طالبان علوم نبوت، اور اصلاح و تربیت کیلئے آنیوالوں کا سلسلہ بڑھتا ہی رہا، حضرت مستقل اسفار و مصروفیات کے باوجود متعدد کتابوں کا درس بھی دیا کرتے تھے، آپ کی عادت تھی کہ چاہے جتنے پرمشقت و طویل سفر سے واپس ہوتے، مگر طلبہ میں اعلان ہو جاتا کہ درسگاہ میں پہونچ جائیں، پھر حضرت

پوری توانائی، نشاط اور انہماک کیساتھ مصروف درس ہو جاتے، سفر کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو پاتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سیل رواں ہو جو بہتا جا رہا ہو، اور کوئی چیز اس کے زور و شور میں فرق نہ ڈال پا رہی ہو، یہ اسباق کبھی رات کے ابتدائی حصے میں ہوتے اور کبھی آخر شب۔ یہ سلسلہ تادم مرگ جاری رہا، ڈاکٹروں اور معالجین کے سفر سے مکمل منع کرنے، اور آرام پر مستقل اصرار کے باوجود ہر دم دعوتی سفر اور تبلیغی مشن کیلئے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھا، آرام و راحت کا انکی زندگی میں کوئی خانہ ہی نہ تھا، انکی لغت حیات ان الفاظ سے خالی تھی، اپنی حیات مستعار کا لمحہ لمحہ امت کی اصلاح کی فکر میں گذارا، پھر بھی یہ سمجھتے رہے کہ ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

چنانچہ خداوند قدوس نے ان کی ان شبانہ روز کی مستقل کاوشوں اور مخلصانہ کوششوں کو شرف قبول بخشا، اور بے مثال و بے بدل مقبولیت و مرجعیت عطا فرمائی، خدائے ذوالجلال نے حضرت میں بیک وقت جو گوناگوں خوبیاں اور خصوصیات جمع فرمادی تھیں وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں، وہ بے انتہا متواضع و خلیق، زاہد و متقی، مخلص و بے لوث، ہمدرد و مشفق، تقویٰ و عبادت کا جیتا جاگتا مرقع تھے، نفع و فائدہ کے مواقع پر دوسروں کو آگے بڑھا کر خود پیچھے ہٹ جانا انکی خاص ادا تھی، بقدر کفاف روزی پر راضی رہنا، کسی کی خواہش و طلب کو رد نہ کرنا، اپنے معتقدین اور ملاقاتیوں سے ہشاش بشاش ہو کر ملنا، اور بالکل نہ اکتانا مسلسل اسفار سے نہ گھبرانا، بلکہ مخلصانہ پیشکش کو بہر صورت شرف قبول بخشنا کوئی ان سے سیکھتا، اور ان سب کاموں میں صرف اللہ کی رضا جوئی اور اعلاء حق کا جذبہ پنہاں تھا، وہ ایک عالم باعمل، باخبر و واقف کار داعی دین، بلند پایہ مربی و معلم تھے۔ حسب ضرورت تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، اپنے بلند پایہ

شیریں اخلاق اور نرم خوئی و خندہ جبینی سے سارے دعوتی مراحل بحسن و خوبی انجام دیتے چلے جاتے تھے، حضرت قاری صاحبؒ کے مواعظِ حسنہ دعوت و تربیت کے میدان میں بڑی تاثیر کے حامل تھے، انہیں بلاشبہ ان کے جدِ امجد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت و خصوصیت صادق آتی تھی "مَن رَآہُ بَدِیہۃً ھَابَہٗ وَمَنْ خَالَطَہٗ مَعْرِفَۃً اَحَبَّہٗ" وہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ اور علم و فضل کا منبع و مصدر تھے، علوم و معارف کی اشاعت و ترویج، وعظ و ارشاد جیسی اہم ذمہ داریوں کی انجام دہی اور اپنی خیرات و برکات سے امت محمدیہ (جسے خیر امت کہا گیا ہے اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ جیسے اوصاف سے نوازا گیا ہے) کو مستفید و مستفیض کرنے میں مصروف و مشغول رہا کرتے تھے، بلاشک و شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکو منجانب اللہ یہ توفیق حاصل تھی کہ وہ رضائے الٰہی کیلئے اپنی عمر عزیز کے سارے لمحات صرف کر دیں، اخلاق و للہیت، قناعت اور دنیا سے بیزاری تمام سرگرمیوں، کاموں اور اسفار میں اللہ کی طرف اقبالِ تام انکی زندگی کے بنیادی عناوین ہیں، حضرت کی دعوتی خصوصیات میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے مدارسِ اسلامیہ سے حضرت کا بڑا خصوصی ربط اور گہرا تعلق تھا، مدارس کے ذمہ داران کی ہر دعوت پر لبیک کہتے اور دور دراز کا سفر بے انتہا جاں سوزی اور محنت و تعب کے باوجود بخلوصِ قلب خندہ روئی سے فرماتے، سیکڑوں مدارس آپ کی سرپرستی میں تھے، جہاں کے جلسوں میں آپ مستقل شریک ہوتے، اور عوام کو اپنے قلب کی صدا سناتے، اور اپنے دل کا درد رکھدیتے، یہ حضرت کا بڑا نرالا انداز تھا، مدارس، طلبہ، اساتذہ و علماء کو حضرت نے دعوت و ارشاد کا خاص میدان بنا لیا تھا، ان سب کے ساتھ ہی حضرت کو ہر طبقہ و حلقہ میں محبوبیت حاصل تھی، عوام و خواص، بزنس مین، سرکاری عملہ،

وزراء وارباب اقتدار، ملازمین وڈاکٹرس سب کے نزدیک یکساں مقبول تھے، یہاں تک کہ برادرانِ وطن غیر مسلم حضرات بھی حضرت سے بڑا گہرا تعلق ومحبت رکھتے تھے، اور بار بار ملاقاتیں کرکے دعائیں لیتے رہتے تھے، حضرت کا حادثۂ وفات مسلمانانِ ہند کیلئے خصوصاً اور عالم اسلام کیلئے عموماً ایک عظیم خسارہ ہے، ایک مربی و حکیم، عالم ربانی، اور داعی مخلص کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا، دعوتِ اسلامی اور تربیت دینی کے میدان میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر ہونا بظاہر حالات مشکل نظر آتا ہے ۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

اللہ تعالیٰ حضرت کی مغفرت فرمائے، انکو جنۃ الفردوس میں مقام علیین سے نوازے، انھیں انبیاء وصدیقین وشہداء وصلحاء کے جلو میں رکھے، پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور امتِ اسلامیہ کو حضرت کا جانشین وبدل عطا فرمائے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْز

مجلات وجرائد کے چند اہم مضامین

عالمِ ربّانی کی رحلت

از: مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

بیسویں صدی کے اس ربع اخیر میں ہندوستانی مسلمانوں کو جن بزرگوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا، اور انکی اصلاح و ہدایت کا کام کیا، ان میں حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندوی علیہ الرحمہ کی ذات سب سے نمایاں تھی، وہ ایک صاحبِ دل شخص اور صاحب نسبت بزرگ تھے، رشد و ہدایت ان کے قدم کے ساتھ چلتی تھی، وہ جہاں جاتے وہاں ہدایت و تقویٰ، خوف خدا اور دینداری عام ہوجاتی، صاف محسوس ہوتا کہ اللہ نے انھیں "قطب الارشاد" کا مقام بخشا ہے، کسی بزرگ کی سب سے بڑی نسبت نسبتِ محمدیؐ ہے، دردمندی و فکرمندی اور خلق خدا کی ہدایت کیلئے بے چینی مولانا کی ذات میں بہت نمایاں تھی، لوگوں کی ہدایت کیلئے جیسی فکرمندی اور دردمندی انکے دل میں تھی، ویسی میں نے بہت کم پائی، وہ سراپا سیر تھے، نہ تیز دھوپ کی پرواہ، نہ سخت ٹھنڈک کی فکر، نہ دن کی نہ رات کی، جہاں جاتے دینی تقاضہ پر جاتے، جہاں رکتے، دین کیلئے اور کام کیلئے رکتے، آرام کیلئے نہیں ٹھہرتے، اللہ نے لوگوں کے قلوب کو انکی طرف مائل کردیا تھا، اور وہ ہر طبقہ میں محبوب و ہر دلعزیز تھے۔

مولانا نے مشہور دینی درسگاہ مظاہر علوم میں تعلیم پائی تھی، اور معروف

صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے بیعت واجازت سے مشرف ہوئے تھے، ابتداء میں فتح پور کے مدرسہ میں درس وتدریس کی خدمت شروع فرمائی، مگر جب انکے گاؤں "ہتھورا" اور اس کے گرد ونواح میں ارتداد و بے دینی پھیلی تو بے چین ہوگئے، اور اسکی سرکوبی اور اصلاح وہدایت میں سرگرم ہوگئے، پھر "جامعہ عربیہ" کی بنیاد ڈالی، اور جو خطہ ارتداد کی لپیٹ میں آچکا تھا اب وہ علم وہدایت کا مرکز بنا ہوا ہے، اس کے علاوہ انھوں نے یوپی، بہار گجرات، راجستھان ومہاراشٹر وغیرہ صوبوں میں سیکڑوں مدارس کی بنیاد ڈالی، اور سرپرستی فرمائی۔

انکی زندگی بڑی مشغول تھی، جامعہ عربیہ میں رہتے تو فجر سے ظہر تک طلبہ کو پڑھاتے، اور خالی گھنٹے میں پچاسوں کی تعداد میں لوگ (ہندو، مسلمان سب) انکی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی ضرورت پیش کرتے، اور انکی دعائیں لیتے، ان کی ذات سب کیلئے تھی، مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی جاتے، اور وہ ہر ضرورتمند وپریشان حال کی مدد کرتے، طبعاً بڑے حلیم، نرم خو، اور منکسر المزاج تھے، سفر وحضر میں بارہا ان سے ملاقات اور نیازمندی حاصل رہی اور ہر جگہ انکی بے نفسی وسادگی اور دردمندی کا وہ گوشہ سامنے آیا، دوسروں کو اپنے سے بڑا بنا لینا، اور اپنے کو چھوٹوں سے چھوٹا بنا لینا، اور عزیزوں وخوردوں کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آنا ان کی طبیعت ثانیہ تھی، وہ سراپا شرافت ومروت تھے، مولانا ایک واعظ ومصلح ہونے کیساتھ اچھے مصنف بھی تھے، اخلاق وآداب، فن تجوید، منطق اور نحو وصرف پر کئی مفید کتابیں تصنیف کی ہیں، انہوں نے پوری زندگی دین اسلام کی جس طرح خدمت کی اس کے اثرات ملک اور بیرون ملک میں برابر محسوس کئے جائیں گے۔ فَرَحِمَهُ اللهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً

(بشکریہ سہ ماہی بحث ونظر پھلواری شریف پٹنہ)

آہ! علم و عرفان کی مسند خالی ہو گئی

از — مولانا حبیب اللہ ندوی

۲۸ر اگست کی صبح کو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اٹھایا تو عزیزم مولانا حبیب الرحمن قاسمی نے غم انگیز آواز میں کہا کہ خبر ملی ہے کہ قاری صدیق احمد صاحبؒ کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، پھر چند ہی منٹ بعد دوبارہ پھر گھنٹی بجی، ڈرتے سہمتے اٹھایا تو عزیزم اقبال احمد سلمہ، نے لکھنؤ سے اس غم انگیز خبر کو دہرایا، احقر دو ہفتہ سے بیمار چل رہا تھا، اس خبر نے کچھ دیر کیلئے اور نڈھال کر دیا مگر اس حالت میں بھی ارادہ کر لیا کہ جنازہ میں کسی طرح شرکت کروں گا، مگر بلڈ پریشر لو ہونے کی وجہ سے ڈاکٹروں نے اتنے لمبے سفر کی اجازت نہیں دی اور سفر نہ کر سکا اس سعادت کی محرومی کا اب تک قلق ہے اور جب بھی یاد آتی ہے تو شرمندگی کا احساس ہوتا ہے، اس محرومی کی تلافی کیلئے جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کو جمع کر کے حضرت مولانا کی خصوصیات کا ذکر کر کے کچھ تعزیتی الفاظ کہے اور گریہ وزاری کے ساتھ دعائے مغفرت کی گئی، اور دوسرے دن جمعہ میں کئی ہزار کے مجمع میں بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم کے لحاظ سے بھی ایک ممتاز مقام

رکھتے تھے، مگر بارگاہ الٰہی سے انکو جو بلند مقام ملا تھا، وہ انکی بے نفسی اور صحابہ جیسی سادہ اور بے تکلف زندگی کی وجہ سے ملا تھا، وہ وَاِذَا رُؤُا ذُكِرَ اللّٰهُ کے واقعی مصداق تھے، انکو اللہ نے جو قبولیتِ عام عطا کی تھی اسکی بنا پر وہ اس حدیثِ نبوی کی زندہ تصویر تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا	اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا
جبرئیل فقال انی احب	ہے تو حضرت جبرئیل کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں
فلانًا فاحبہ قال فیحبہ	فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تو تم بھی محبت کرو
جبرئیل ثم ینادی فی السماء	وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور پھر آسمان میں
فیقول ان اللہ یحب فلانًا	اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے
فاحبوہ فیحبہ اهل السماء	محبت کرتا ہے تو تم لوگ بھی محبت کرو، تو آسمان
ثم یوضع لہ القبول فی الارض	کے فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، اور پھر یہ
(مشکوٰۃ)	قبولیت اہل زمین میں ڈال دی جاتی ہے۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعلق مع اللہ، اتباعِ سنت، ورع وتقویٰ اور عشقِ رسول کے جس بلند مقام پر تھے، الفاظ میں اسکی تصویر کشی ممکن نہیں اور نہ اس مرتبۂ بلند تک معمولی عزم وارادہ اور بے شعوری سے پہنچنا آسان ہے

سعدیا کنگرۂ عشق بلند است و بلند
دست ہر بوالہوس آنجا بہ فضولے نہ رسد

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے ممتاز شیخ طریقت ہی نہیں بلکہ ایسے قطب الارشاد تھے کہ مسلمان، عوام، خواص اور علماء ومشائخ، بلکہ غیر مسلم تک جوق در جوق پروانہ وار ان تک پہونچتے تھے، مگر وہ خانقاہی آداب اور رکھ رکھاؤ کو اپنے قریب تک نہیں آنے دیتے تھے، بلکہ عام آدمیوں کی

طرح ملتے جلتے، ادھر کئی برس سے وہ کمزور ہوگئے تھے، مگر معمولی آدمی کی دعوت کو بھی وہ ٹھکراتے نہیں تھے۔ ایک ایک سفر میں دسیوں پروگرام لوگ بنوا لیتے اور وہ سب کی دلجوئی کی خاطر رات دن ایک کر کے یہ زحمت اٹھا لیتے ۔

راقم الحروف نے انھیں کئی بار مدرسہ پر آنے کی زحمت دی، اور اپنی شفقت سے انہوں نے بہرہ ور کیا، ایک بار ادھر سے گزر ہوا، تو خود ملاقات کے لئے تشریف لائے، اور اپنی شفقتوں سے نوازا، علماء کے طبقہ میں انکی جیسی خورد نوازی بہت کم دیکھنے کو ملی، کئی برس پہلے احقر نے اپنی کتاب "دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں" ایک صاحب کے ذریعہ ان کی خدمت میں بھیجی، کتاب پڑھ کر انہوں نے ایک صاحب سے کہلایا کہ ان سے کہو کہ یہ باتیں وہ آکر طلبہ کے سامنے کہیں اتفاق سے احقر اس وقت لکھنؤ میں موجود تھا، مولوی منظر صاحب ندوی کو فون کیا کہ میں کانپور آرہا ہوں آپ گاڑی سے مجھے باندہ لے چلیں، وہ لے کر مجھے وہاں گئے، جونہی گاڑی مدرسہ کے احاطہ میں پہونچی وہ پڑھا رہے تھے دیکھتے ہی ننگے پیر گاڑی تک تشریف لے آئے، اور ساتھ کمرے میں لے گئے، چھٹی کی گھنٹی بجوائی طلبہ واساتذہ کو جمع کر کے کچھ کہلوایا، اپنی کم مائیگی کو دیکھتے ہوئے، اسی بے نفسی اور خاکساری نے پانی پانی کر دیا، انکی کرم فرمائیوں کو یاد کرتا ہوں تو بار بار آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں کہ اب ایسی خورد نوازی کہاں دیکھنے کو ملے گی ۔

انکی ذات سراپا کرامت تھی جس کا ظہور سفر و حضر میں ہوتا رہتا تھا، مگر ان کی کسی ادا سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اخص الخاص مقبول بارگاہ الٰہی ہیں، باندہ کا علاقہ بڑا شورش پسند علاقہ تھا، مگر انکے سامنے بڑے بڑے ڈاکو سرنگوں ہو کر آتے تھے، ایک مرتبہ مولانا رات کو باندہ اسٹیشن پر اترے کوئی سواری

نہیں ملی پیدل ہتھورا کیلئے روانہ ہوگئے، ایک جھولے میں کچھ رقم ساتھ تھی، راستہ میں ڈاکوؤں نے چھین لیا، جب اس رقم کا ڈاکوؤں کے سردار کے سامنے ذکر آیا تو وہ صبح کو خود خدمت میں لیکر حاضر ہوگیا، اس طرح کے نہ جانے کتنے خرق عادت واقعات پیش آتے رہتے تھے،

غالباً مدرسہ انکی ذاتی زمین پر بنا ہے، بحمد اللہ مدرسہ کی بڑی شاندار عمارتیں کھڑی ہیں، مگر ان کے پرانے مکان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکی، اور نہ اپنے لئے کوئی علاحدہ مکان بنایا، غرض یہ کہنا صحیح ہوگا۔

سے داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انکو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور المرءُ مع من احبَّ کے طفیل میں جنت میں انکی معیت عطا فرمائے آمین

اپنے پیچھے انہوں نے تین صاحبزادوں کو چھوڑا ہے مولانا حبیب احمد مولانا نجیب احمد اور مولانا حسیب احمد، بحمد اللہ تینوں عزیزان گرامی الولدُ سِرٌّ لابیہ کے مصداق ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں اپنے والد محترم کا حقیقی جانشین بنائے، اور ان کے علم وفضل کی مسند وہ سنبھالیں۔ آمین

(بشکریہ ماہنامہ "الرشاد" اعظم گڑھ)
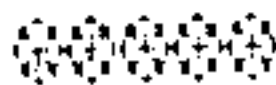
از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

مولانا صدیق احمد باندوی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے علیہ الرحمۃ والرضوان

کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

۲۷ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ ۵ مئی ۱۹۹۷ء کی بات ہے کہ آں مرحوم والد ماجد کی وفات کی خبر پر صبح ساڑھے آٹھ بجے اپنے مکان باندہ سے ہمارے گھر پہونچے اور سوا نو بجے دار العلوم ندوۃ العلماء کے میدان میں نماز جنازہ کی امامت فرمائی کوئی واہمہ بھی دل میں نہ گزرا تھا کہ اب دوبارہ اس سراپا نور و تقدس چہرے کی زیارت نصیب نہ ہوگی، غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَاَعْلٰى مَرَاتِبَهُ۔

بلا کسی عقیدت مندانہ مبالغے کے معصومیت اور پاکیزگی کا نور چہرے پر بولتا تھا، اور رفتار و گفتار ہر بات سے اس کی تصدیق ہوتی تھی "مادر زاد ولی" کا ایک محاورہ ہے یقیناً وہ حضرت مولانا مرحوم جیسے لوگوں ہی کی بدولت وجود میں آیا ہوگا، بے نفس و بے ریا اللہ والوں کی چلتی پھرتی تصویر تھے، حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ نے ۱۱ مئی کے والد ماجد کے تعزیتی جلسے کی تقریر میں اہالیانِ لکھنؤ سے

تعزیت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان کے درمیان سے ایک ایسی بابرکت ہستی اٹھا لی گئی، جیسی ہستیوں کی بدولت اللہ کی رحمتیں نازل ہوتیں اور بلائیں ٹلتی ہیں، ذرا بھی مبالغہ یہ کہنے میں ہرگز نہ ہوگا کہ اگر والد ماجد حیات ہوتے، تو بالکل یہی بات مولانا مرحوم کے بارے میں وہ خود فرماتے، اپنی نماز جنازہ کیلئے مولانا کے بارے میں انکی وصیت کھلا ثبوت ہے کہ وہ اپنے سے بہت کم عمر مولانا صدیق احمد صاحبؒ کے بارے میں کیا گمان رکھتے تھے، مولانا کی عمر زیادہ سے زیادہ پچھتر برس ہوگی، اور والد کے ساتھ ان کا تعلق بالکل وہی تھا جو چھوٹوں کا اپنے بزرگوں کے ساتھ ہوتا ہے، اور ہم سب بھائیوں سے وہ اسی تعلق کے رشتے سے بڑی محبت فرماتے تھے۔

اپنے علم کی حد تک مولانا مرحوم کی سب سے بڑی خصوصیت خلق خدا کی ہر ممکن طور سے خدمت، اور اسکو نفع پہنچانا تھا، حدیث شریف میں آتا ہے "خیر الناس من ینفع الناس (سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو آدمیوں کو نفع پہونچائے) مولانا کم گو تھے، صرف ایک ہی دفعہ ایک مختصر سی تقریر سننے کا موقع ملا، اور وہ اسی حدیث سے شروع ہوئی تھی، اور اس کو سن کر اندازہ ہوا تھا کہ مولانا نے شاید اسی حدیث کو گرہ باندھ لیا ہے، جنھوں نے نہیں دیکھا وہ یقین نہیں کرسکتے کہ کوئی آدمی اس طرح بھی اپنے کو "وقف فی سبیل اللہ" کرسکتا ہے، ان کا شاید اپنا کوئی وقت نہیں رہ گیا تھا مستجاب الدعوات اور سراپا دست شفا سمجھے جاتے تھے، سارے ملک سے مخلوق مولاناؒ کے مستقر (مدرسہ عربیہ اسلامیہ ہتھورا ضلع باندہ، یوپی) پر بھی ٹوٹتی تھی، اور مولاناؒ سفر بھی خوب کرتے تھے، تو جدھر کو نکل جاتے مخلوق پیچھے پیچھے ہولی تھی، اور جس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آتا ہے کہ کوئی بھی حاجتمند آپ کو راستے میں پکڑ کے اپنی ضرورت کے

لئے روک لیتا تھا، اتباع خلق محمدیؐ میں مولانا مرحوم نے بالکل یہی شان اپنا رکھی تھی، اس کا منظر اسی گذشتہ اپریل میں والد ماجد مرحوم کی علالت کے دنوں میں اسی نرسنگ ہوم کے دروازے پر دیکھا، جس میں والد ماجد زیر علاج تھے کہ موٹر میں بیٹھنے جا رہے ہیں، اور وہاں کسی نے سفارشی خط کیلئے پکڑ لیا، تو وہیں موٹر کے انجن والے حصے پر کاغذ رکھے ہوئے کھڑے کھڑے خط لکھنے میں مشغول ہیں۔

یوں تو موت کا وقت پیدائش کے ساتھ ہی مقرر ہو چکا ہوتا ہے، یعنی موت کا آنا امر الٰہی سے ہوتا ہے، مگر ظاہر اسباب میں تو مولانا کو حاجتمندوں کی "بے رحمی" نے مارا کہ انکو نہ سونے کا وقت ٹھیک سے تھا نہ آرام کرنے کا، لیکن اب وہ انشاء اللہ ابدی آرام کی گود میں ہیں۔ (بشکریہ ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ)

از ــــ مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی
(دارالعلوم گورکھپور)

زندگی کا پہلا اتفاق ہے کہ میں کچھ کہنے یا لکھنے بیٹھا ہوں تو نہ جانے کیوں بے انتہا رونے کو جی چاہتا ہے، اور آنسو بھی نہیں نکلتے ؎

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہوجاتے ہیں طغیانی نہیں آتی

قاری صدیق احمد صاحبؒ فرشتہ نہیں انسان تھے، اسلئے گذر گئے، مگر ایسے انسان تھے جنکو ڈھالنے کیلئے انبیاء واولیاء تشریف لاتے تھے، جن کا سانچہ قرآن پاک تھا، یا حدیث پاک تھی، انکا چلنا پھرنا، پڑھنا پڑھانا، وعظ وتبلیغ اور تعویذ ودعا جو کچھ تھا نہ پیسہ کیلئے تھا، نہ شہرت واقتدار کیلئے صرف خدمت کیلئے تھا، اور یہ سارے کام بے تکان اور بے پناہ کرتے تھے، صرف آخرت اور شوقِ قبولیت کیلئے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائیں، حضورؐ کے سامنے رسوا نہ ہونا پڑے، مسلمانوں کا کام ہوجائے ؎

میں نے ان کا بچپن دیکھا نہیں جوانی دیکھی ہے، بڑھاپا دیکھا ہے، اور

سفرِ آخرت دیکھ کر حیران ہوں کہ وہ اللہ کی نعمت اچانک ہم سے کیسے چھن گئی، جو شخص اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ سوچ سمجھ کر خرچ کرتا تھا، کیا اسے اتنے ہی لمحات عطا کئے گئے تھے، اس لئے وہ انھیں دین و ایمان پر نچھاور کر کے چلا گیا

ع جانے والے تجھے ہزاروں سلام

انعامِ الٰہی

ہم ہر نماز میں اور اس کی ہر رکعت میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا مانگتے رہتے ہیں، اور ہر دعا میں اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے، مگر ہم نہیں سوچ پاتے کہ آج ہمارے ارد گرد وہ لوگ ہیں جن کو اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کہہ کر ہمارے خدا نے، ہمارے رسولؐ نے ہم سے تعارف کرایا تھا۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قارون کا خزانہ، فرعون کی شوکت، نمرود کا دبدبہ، اور شداد کی جنت انعامِ الٰہی نہیں ہے، اور ہرگز نہیں ہے — پھر نعمتِ الٰہی کیا ہے، اور اسکے مستحق کون لوگ ہیں؟ قرآن کہتا ہے مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ یعنی علمِ نبوت، اسلامی زندگی، صدیقی کیفیات اور شہداء کے جذبات انعامِ الٰہی ہیں، وہ انعامِ الٰہی جن کے لئے قرآن نے شہادت دی ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ یعنی پیغمبرِ اسلام کو خدا کا سب سے بڑا اور مکمل انعام جو ملا وہ دین و اسلام کی شکل میں ملا، اس لئے صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عشرہ مبشرہؓ، اور ہزاروں ہزار صحابہ و اولیاء انعام یافتہ تھے اور ہیں، لہٰذا ہمیں ہر زمانے اور ہر ملک میں ان ہی انعام یافتہ حضرات کو اور انکے نقشِ قدم کو تلاش کرنا چاہئے، اور جب مل جائے تو اس پر چل کر اللہ تعالیٰ کے انعام کا اپنے کو مستحق بنانا چاہئے۔

ہم نے اپنے علم و یقین اور دیانت کی حد تک جہاں حضرت معین الدین چشتیؒ حضرت خواجہ باقی باللہؒ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

ایسے حضرات کو اہل اللہ، اہل دین، اہل اسلام، اور اہل صدق وصفا سمجھتے ہیں۔ وہ ہیں حضرت گنگوہیؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ جیسے اولیاء اللہ کو بھی الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ میں شمار کرتے ہیں، اور مولانا وصی اللہ صاحبؒ، مولانا محمد احمد صاحبؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ، مولانا انعام الحسن صاحبؒ اور قاری صدیق صاحبؒ کو ان ہی حضرات کی صف میں شمار کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اخلاصِ عمل کی دولت نصیب فرمائے۔

غلط مشورہ میں نے بے تکلفی کی وجہ سے ایک مرتبہ ان سے کہا، اور ان کے حالات اور انکی پریشانیوں کو دیکھ کر بطور مشورہ عرض کیا کہ: قاری صاحب! آپ دوسروں کی رعایت بہت کرتے ہیں، آخر اپنے ساتھ رعایت کیوں نہیں کرتے، قاری صاحبؒ مسکرا کر رہ گئے۔

میں نے دنیاداروں کے لائن کی بہت نفیس بات کہی تھی، مگر قاری صاحبؒ آخرت کی لائن پر چل رہے تھے، میری گستاخی پر مسکرا کر آگے بڑھ گئے، اور لوگوں کے ہجوم، پروگرام کی کثرت اور تقاضوں کی بھرمار میں ہنستے ہنساتے گذر گئے اور اس طرح گذرے کہ پچھلے ہفتے دل کی تکلیف کی وجہ سے ایک نرسنگ ہوم میں داخل تھے، ڈاکٹروں نے آرام کا اور نہ بولنے کا مشورہ دیا تھا معلوم ہوا کہ ...... مقام سے .... صاحب آئے تھے، انہیں اندر بلا لیا اور فرمایا کہ لوگ کتنی محبت سے کتنا سفر کر کے آتے ہیں، اور میں ان سے سلام، دعا بھی نہ کر سکوں یہ کیا بات ہوئی، یہ تھے قاری صدیق صاحبؒ اور یہ تھی محبت کے جواب میں محبت۔

خلوص خلوص کے معنی لغت میں لکھے ہیں: بے غرض، بے نمود صرف محبت و للّٰہیت کی وجہ سے کوئی کام کرنا، قرآن وحدیث میں اس کا معیار اور آخری نشانہ بتایا گیا ہے، مگر موجودہ زندگی میں تلاش کیجئے تو لوگوں کو نہ اسکی

حقیقت معلوم نہ کیفیت نہ معنی، ایک لفظ ہے جس کے کوئی معنی نہیں، ایک پھل ہے جس میں کوئی لذت نہیں، ایک تصویر ہے جس کا کوئی مجسمہ نہیں۔

مگر قاری صاحبؒ سے ملئے، اِن سے معاملات کیجئے یا ان کے ساتھ سفر کیجئے تو آپ خلوص کے معنی ہی نہیں بلکہ اسکی گرمی اور اسکی لذت بھی محسوس کر سکتے تھے، وہ چکھا دیا کرتے تھے اسکی مٹھاس۔

۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء کی بات ہے میں گونڈہ مدرسہ فرقانیہ کا مدرس تھا، وہیں پہلی مرتبہ قاری صاحبؒ سے ملاقات ہوئی تھی، تیسری ملاقات اسوقت ہوئی جب قاری صاحبؒ نے اپنے گھر سے قریب اپنی ٹوٹی پھوٹی مسجد میں چند لڑکوں کو فارسی، عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں، اور پھر ہتھورا سے گونڈہ کا کئی سو میل کا سفر کر کے انھیں لائے اور میرے سپرد کر کے چلے گئے کہ انھیں پڑھاؤ، دوسرے سال پھر چار بچوں کو لیکر آئے، اور پہونچا کر چلے گئے، ہم پڑھاتے ہیں تو اس کی فکر نہیں رکھتے کہ پھر اس کے بعد وہ کہاں جائیں گے اور کیا کریں گے، اور قاری صاحبؒ کا خلوص باپ کی طرح نہ صرف مستقبل کیلئے اچھا مشورہ دیتا ہے، بلکہ خود انھیں ساتھ لیکر اتنی لمبی مسافت پر پہونچ آیا ہے۔

صرف اسوجہ سے پہنچا آتا ہے کہ بچوں کو وہ جس طرح کی تربیت دینا چاہتے تھے ان کے نزدیک وہ مدرسہ فرقانیہ ہی میں ہو سکتی تھی، اس لئے از راہِ محبت و اخلاص وہاں پہونچا گئے، پھر لڑکے پڑھ کر گئے، اور وہیں کتابیں پڑھانے لگے، اور مولانا نفیس اکبر جیسے لوگ ساتھی مل گئے۔

ایک بار ہنسور ضلع فیض آباد جلسے میں جا رہے تھے، راستے میں ٹانڈہ سے گذرے تو وہاں کا مشہور مدرسہ کنز العلوم سامنے آیا، اتر کر اندر گئے تو وہاں کوئی نہ تھا، سب لوگ قاری صاحبؒ کو دیکھنے ہنسور گئے تھے، قاری صاحبؒ نے

مدرسہ کیلئے صحن میں کھڑے ہو کر دعا فرمائی، اور پھر سنسو تشریف لے گئے۔

ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ مدرسہ میں مسجد بن گئی ہے، کسی موقع سے آکر دعا کر دیجئے، سن کر چلے گئے، اس کے کچھ دنوں بعد بہار سے لوٹے تو گورکھپور میں کوئی پروگرام تھا مولانا حکیم وصی احمد صاحبؒ کے یہاں آئے، اور سیدھے دار العلوم رسول پور مسجد میں گئے، دو رکعت نماز پڑھی دعا کی، اور پھر فوراً ہی واپس چلے گئے، نہ چائے، نہ بسکٹ، نہ پانی نہ مصافحہ، نہ اتنی مہلت کہ سب لوگوں کو معلوم ہوسکے کہ قاری صاحب آئے ہیں، واپس گئے تو طبیعت خراب ہوگئی، کانپور میں بھرتی ہوگئے، میں دہلی سے واپس ہونے لگا تو کانپور اتر کر نرسنگ ہوم گیا، کسی نے خبر کر دی تو فوراً بلا لیا، بہت خوش ہوئے، اور آتے وقت کہنے لگے، کہ تم نہیں تھے مگر میں تمہاری مسجد میں ہو آیا، اللہ اکبر۔

ایک معمولی گذارش پر اتنا خیال کون کرے گا، اس لئے یہ باتیں مدتوں یاد رہیں گی، اور آمادہ کرتی رہیں گی کہ اسی نقش قدم پر چلا جائے۔

شفیق استاد

ہتھورا کا تیسرا سال تھا، ایک صاحبزادے نے تنگ کر دیا تھا، اس لئے سوچا کہ اسکو کانپور پہنچا دوں، ممکن ہے وہاں سدھر جائے، یہ تھے حضرت قاری عبد الوہاب صاحب گونڈویؒ کے بڑے صاحبزادے حافظ عبد التواب سلمہٗ۔

وہاں مشکل سے پہونچا، دیکھا تو بہت چھوٹی سی مسجد ٹوٹی پھوٹی، اور اسمیں دس بارہ بچے پڑھ رہے ہیں، سامنے کسی کمرہ میں رہتے ہیں، فجر کے وقت سے مغرب کے بعد تک پڑھتے ہیں، باہر سے لکڑیاں توڑ کر لاتے ہیں، اپنے ہاتھ سے چولہا جلا کر کھانا پکاتے ہیں، پھر پڑھتے ہیں، اس بے سروسامانی کو دیکھکر

وحشت ہوئی، مگر دن بھر رہا تو نظر آیا کہ بچوں میں مایوسی ہے نہ گھبراہٹ، نہ اداسی ہنستے کھیلتے بچے، پڑھتے اور یاد کرتے بچے، فجر سے نو بجے تک پڑھنا، پھر لکڑی توڑ کر لانا، پکانا، اور پھر کھاپی کر پڑھنے میں لگ جانا، اور قاری صاحب کوئی بزرگ نہیں قاری صاحب تھے، بلکہ ان کے ساتھ ان کا باپ موجود تھا، کس کی روٹی کس طرح پک رہی ہے، کس کا چاول کیسے پک رہا ہے، اور کس بچے کو کیا ضرورت ہے، کیسے پوری ہوگی، انھیں ہر وقت احساس رہتا تھا۔

تب سمجھ میں آیا کہ قاری صاحبؒ نے اس بے سروسامانی میں بچوں کو کسطرح جمع کر رکھا ہے، اور انکو محنت ومشقت کا عادی بنادیا ہے۔

چنانچہ عبدالتواب وہاں پڑھتا رہا، اور جو وہاں پہونچ گیا، وہاں سے پڑھ کر نکلا، اور جب نکلا تو اس کے پاس علم بھی تھا، دین بھی، اخلاق اور سب سے انمول یہ کہ محنت ومشقت کا عادی بن کر نکلا۔

اس توجہ، اس شفقت اور اتنی محنت کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ ٹوٹا پھوٹا مدرسہ ایک عظیم الشان درسگاہ بن گیا، چنانچہ جب قاری صاحب پچھلی جمعرات کو وفات پاگئے، اور ہم لوگ رات میں ہتھورا پہونچے تو وہاں ایک علمی قلعہ کھڑا ہے، دومنزلہ کشادہ، وسیع اور مضبوط قلعہ، خدا اسے قبول فرمائے (آمین) اور اپنے رجال کا مہیا کرنے، جو ایسی شفقت، ایسی محنت اور خلوص سے طلبا کی خدمت کرسکیں، علم کی خدمت کرسکیں، دیکھنا ہے قاری صاحبؒ کے شاگرد اپنے استاذ کے نقوشِ قدم کو کہاں تک اجاگر کرتے ہیں، اور انھیں کس طرح زندہ رکھتے ہیں۔

قاری صاحبؒ بہت سادہ مزاج انتہائی سیدھے سادے، مگر بیدار مغز بھی تھے، اسی لئے ترک مالایعنی کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، اتنا اہتمام کہ ہم جیسے اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند جیسا علم کا ادارہ اور اسکی

سب سے مقتدر مجلس شوریٰ تھی جس میں ملک کے مشاہیر علماء و فضلاء اور دینی حلقوں کے ممتاز لوگ منتخب کئے جاتے تھے، اس مجلس کی ممبری دنیاوی اعزاز اور دینی خدمت کا اچھا موقعہ ہے، مجلس شوریٰ نے حضرت گنگوہیؒ کے وقت سے دارالعلوم کا ایک مزاج بنایا اور اسے سنبھالے رکھا تھا، قاری صاحبؒ کو مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے اس وقت ممبری کیلئے پیش کیا جب دارالعلوم میں گروپ بندی شباب پر تھی، لیکن حضرت قاری صاحبؒ کے نام پر پوری مجلس شوریٰ مطمئن تھی، وہ بحیثیت ممبر مجلس شوریٰ میں شریک ہوتے رہے، کبھی کبھی علماء کو خطاب بھی فرمایا، لیکن چند سالوں کے بعد جب دارالعلوم مولانا اسعد صاحب کی تحویل میں چلا گیا، اور پورے نظم و ضبط سے چلنے لگا، تو معلوم ہوا کہ قاری صاحبؒ نے مجلس شوریٰ سے استعفیٰ دیدیا، میں نے اسکی وجہ پوچھی تو کہنے لگے، کہ وہاں بہت وقت ضائع ہوتا تھا، ایک گھنٹے دو گھنٹے کا کام اور دو دو دن ضائع کرنے پڑتے تھے، خود مولانا اسعد صاحب نے سنا تو انکو حیرت ہوگئی، مگر قاری صاحبؒ ہمیشہ کیلئے یکسو ہو چکے تھے یکسو رہے۔

اسی طرح پچھلے سال جمعیۃ علماء ہند نے بمبئی میں شاندار اجلاس کیا، اور اس میں بڑے بڑے نیتا، اور وزراء بھی شریک ہوئے، میں اس دور میں بمبئی گیا ہوا تھا دیکھا تو بہت مخلصانہ کوشش جاری تھی، کہ حضرت قاری صاحبؒ کو اجلاس میں لایا جائے چنانچہ بمبئی سے گجرات تک کوشش جاری رہی مگر قاری صاحب سیاسی جلسوں میں نہ جاتے تھے، نہ اسمیں شریک ہوئے، نہ انکے شریک ہونیکی کوئی ضرورت تھی، بلانے والوں کا مقصد انکی شخصیت نہیں انکی شہرت تھی، اس طرح میں نے بارہا دیکھا کہ وہ دیکھ سنکر فیصلہ فرماتے تھے، جب سفر یا شرکت پر آمادہ ہوتے تھے اور جیسے ہی ضرورت پوری ہوتی تھی، دوسرے تقاضوں پر روانہ ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ بستی تشریف لائے میں حاضر خدمت ہوا، بستی سے کچھ دور ایک مدرسہ پر جانا تھا، ہم لوگ بھی ساتھ ہولئے، مغرب بعد تھوڑی دیر ہمارے ساتھ چائے پانی کرتے رہے، اس کے بعد مجلسی گپ شپ کی جگہ سے وہ اٹھے، اور سامنے کے دوسرے برآمدے میں جا کر ایک مصلی پر بیٹھ گئے، اور تسبیح پڑھنے لگے، تب سمجھ میں آیا کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا کا کیا مطلب ہے، اور ذکر الہی کا کیا درجہ ہے، اور اسکے لئے ترکِ مالا یعنی کی کتنی ضرورت ہے۔

بے تکلفی گورکھپور کے حکیم وصی احمد صاحبؒ اور قاری صاحبؒ سہارنپور میں ایک ہی کمرہ میں رہتے تھے، اس لئے بچپن سے بے تکلفی تھی اس لئے جب گورکھپور سے گذرتے تھے تو حکیم صاحبؒ کے یہاں ضرور تشریف لاتے تھے، اور عموماً آمد رات میں ۱۲ ربجے، ۳ بجے یا ۴ ربجے ہوا کرتی تھی، کسی گاڑی سے اترے، اور گھر پہونچکر زور سے کنڈی کھٹکھٹائی دیکھئے تو قاری صاحبؒ

چنانچہ حکیم صاحبؒ فرماتے تھے کہ رات میں بے وقت جب کسی نے کنڈی بجانے کی جرأت کی تو وہ قاری صاحبؒ ہوتے تھے۔

آئے اور کہا روٹی لاؤ، سالن لاؤ، اور جو کچھ ہوتا جس طرح ہوتا عورتیں حاضر کر دیا کرتی تھیں ـــــــ بے تکلف تھے تو اسقدر ـــــــ

چند مہینے ہوئے ہیں کوپاگنج جلسے میں تشریف لائے، ایک بجے جلسے سے فارغ ہوئے، صبح کو دوسرا پروگرام تھا، کہنے لگے کہ گاڑی ہو تو بلتھرا جا کر..... صاحب سے مل آتا ہوں، چنانچہ وہاں گئے اور فوراً واپس آئے کوپاگنج میں فجر کی نماز پڑھی۔

شوقِ مطالعہ ایک جلسے میں آئے اور موقع ملا، تو کوئی کتاب ساتھ تھی

مطالعہ شروع کر دیا، دیکھا تو شیخ زادہ کا مطالعہ فرمارہے ہیں، آجکل طلبہ کو بیضاوی پڑھا رہے ہیں، کہاں متھورا اور کہاں گونڈہ بستی کے اسفار اور پھر مطالعہ کی گنجائش، مگر وہ ہر جگہ کتاب ساتھ رکھتے تھے، اور اس میں مشغول ہو جاتے تھے، ہم لوگوں کو یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہم سے مشغول کیوں نہیں رہتے، اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جو وقت مل گیا ہے اسے گپ شپ میں کیوں ضائع کر دوں ۔ ع جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است

جو حضرت قاری صاحبؒ کے سفر در سفر سے واقف ہیں، انکی سمجھ میں آسکتا ہے کہ قاری صاحبؒ ملاقات، تعویذ، تقریر، آرام اور سفر کے اندر سے کسطرح وقت نکال کر لکھنے، پڑھنے کی مشق جاری رکھتے تھے، اور ان کی اس مشاقی کا اثر ہے کہ انھوں نے سلّم العلوم جیسی مشکل کتاب کو حل کر دیا، شرح جامی کی مشکلات حل کر دیں، اور ایسے ایسے نجانے کتنے رسالے اور کتابچے لکھ ڈالے، ایسے کتابچے جن کیلئے بڑے طویل مطالعے اور بہت یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔

تقریر و خطابت تقریر کیلئے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا ابوالوفاءؒ، اور قاری محمد طیب صاحبؒ مشہور و معروف ہیں، مگر قاری صدیق صاحبؒ عجیب مقرر تھے، برجستہ بولتے تھے، اور بے تکان بولتے تھے، اس میں نہ شعر، نہ چاشنی، نہ قرارت کا زور، اس کے باوجود بلا کی تاثیر تھی، جو کچھ کہتے تھے، قرآن و حدیث کی روشنی میں کہتے تھے، اور جب جلال آجاتا تھا، تو اچھے اچھوں کو پسینہ آجاتا تھا، مگر کہنے کا انداز خوب تھا، بہت پیارا، بڑا دلنواز۔

ایک مرتبہ بھیونڈی میں تقریر کرنے آئے، مدرسہ کا جلسہ تھا، آدھی رات کا وقت تھا، مگر لوگ شوق میں بیٹھے ہوئے تھے، فرمانے لگے کہ آپ لوگوں نے

اجلاس کو خوب سجایا ہے، محنت بھی کی ہے، پیسے بھی لگائے ہیں، اور خوب لگائے ہیں، تعریف کرکے فرمایا: کہ اس سجاوٹ اور ٹھاٹ سے اگر کچھ پیسے بچ گئے ہوں، تو غریب مدرسہ کو بھی دیدیجئے، یہاں بچے دین پڑھتے ہیں، دین سیکھتے ہیں آپکو دعائیں دیں گے، اتنی سی بات پر بیٹھنے والوں کو اتنی غیرت آئی کہ لوگوں نے چندہ دینا شروع کیا، اور تقریر شروع ہوتے ہوتے تین ہزار روپئے برس پڑے۔

ایک مرتبہ بستی میں فرمایا کہ قرآن کا دعویٰ ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کہ اچھے ہوں یا برے، امیر ہوں یا غریب، تندرست ہوں یا بیمار مرنا سبکو ہے اور مرتے بھی سبھی ہیں، تم بتاؤ کس طرح مرنا چاہتے ہو، مرنے کی کیا تیاری کررکھی ہے، گھر والوں کو کیا تیار کرایا ہے؟ اگر نہیں کی ہے تو اب تیاری کرو، کچھ پتہ نہیں کہ موت کب آئے، کہاں آئے، کوٹھی میں یا جھونپڑے میں، مرنا بہر حال ہے خدا صرف یہ پوچھے گا کہ میرے رسول کی اتباع کرکے آئے ہو، یا اس کے خلاف چل کر آئے ہو، سوچ لو کیا جواب دوگے؟۔

قاری صاحبؒ کی تقریر میں تلقین کا پہلو بہت ہوتا تھا، اس لئے محبت والے دلوں میں انکی بات تیر کی طرح پیوست ہوجاتی تھی، اور زندگی میں ہلچل ڈالدیتی تھی۔

ایک مرتبہ لوگوں کے ہجوم سے گھبراکر اسٹیج پر آئے، خوب جھاڑا کہ تم لوگ مجھ پر کیوں ٹوٹے پڑتے ہو آخر یہاں بڑے بڑے علماء تشریف رکھتے ہیں، شیخ الحدیث بیٹھے ہوئے ہیں، تم ان سے مصافحہ بھی نہیں کرتے اور میرے اوپر گرے پڑے ہو، یہ کیا بات ہے، اگر علم کی محبت ہے تو علماء موجود ہیں حدیث کی محبت ہے، تو شیخ الحدیث موجود ہیں، مگر ان حضرات کی تم کو کوئی

قدر نہیں ہے یہی تمہاری تباہی کا سبب ہے، تم علماء کو چھوڑ کر میرے اوپر اس لئے گرتے ہو کہ میں تعویذ لکھ دونگا، مگر علماء کی ناقدری تمہیں تباہ کر دے گی۔

روحانی خلاء فون پر مولانا ہاشمی سابق ایم پی، سے رابطہ ہوا تو بتایا کہ باندہ سے واپس ہوا ہوں، بڑا افسوس کا ہے کہ جب لوگ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے تھے، تو قاری صاحبؒ کے پاس دوڑ جاتے تھے کہ دعا فرمائیں؛ اور وہ عوامی آدمی تھے فوراً دعا فرما دیتے تھے، لیکن اب انکے بعد لوگ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ میں نے کہا کہ بالکل اندھیرا چھا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالحمید سے قاری صاحبؒ کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایسے حضرات امت میں رہتے ہیں تو امت عذاب الٰہی سے محفوظ رہتی ہے، تباہی اور بربادی سے انکی پناہ میں رہتی ہے، قاری صاحبؒ کے بعد وہ پناہ ختم ہوگئی، اور یہ سب سے بڑا نقصان ہے۔

پروفیسر صاحب کی بات پر مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی جس میں خدا نے مکہ میں عذاب نازل نہ ہونے کی وجہ بتائی ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۔ خدا کی طرف سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپؐ کی موجودگی میں بھی ان پر عذاب آجائے، یعنی صلحاء کی وجہ سے کفار و فجار کو بھی عذاب الٰہی سے پناہ ملی رہتی ہے۔

آخرت کا سفر ایک ہفتہ پہلے لکھنؤ سے شفا پا کر باندہ پہنچے تھے اور اپنے تمام کام حسب سابق کرنے لگے تھے، انکو یاد بھی نہیں رہا کہ وہ دل کے دورے سے چھٹی پا کر آئے ہیں، ہفتہ، عشرہ آرام کر لیتے، بدھ کی شام کو ہردوئی جانا تھا، پیر طریقت حضرت مولانا ابرارالحق صاحب مدظلہ کے یہاں مدعو تھے، کہنے لگے ابھی وقت ہے، لاؤ کتاب پڑھ لو، سلم العلوم جیسی تہہ دار کتاب

پڑھائی پھر بھی وقت باقی رہا، بخاری منگائی اور پڑھانا شروع کر دیا، ظہر بعد کہہ رہے تھے کہ آج موت کے آثار معلوم ہو رہے ہیں، چنانچہ سبق پڑھاتے پڑھاتے طبیعت سست ہو گئی، اسکے علاج کیلئے فرمایا لاؤ وضو کر لیں، وضو کے درمیان سردی لگی، لیٹ گئے، بخار چڑھ آیا، پھر قے ہوئی، پھر فالج کا اثر ہوا، کانپور جاتے جاتے طبیعت اور خراب ہوئی، رات کے دو بجے وہ لکھنؤ کے راستے میں بیہوش ہو گئے، اور لکھنؤ پہونچکر صبح ۸ بجے دنیا چھوڑ، ہمیشہ کیلئے اللہ کو پیارے ہو گئے، موت کے آثار کا غالباً یہ مطلب تھا کہ وہ موت کے فرشتے نظر آنے لگے تھے جو باندہ سے لکھنؤ لیجا کر وہاں سے سفر آخرت کرانے کا حکم پاکر آ گئے تھے، اور اس کے اثرات محسوس ہو گئے تھے۔

قرآن کا صریح حکم ہے کہ موت کا وقت اور اسکی جگہ مقرر ہے، اسلئے انھیں لکھنؤ پہنچا دیا گیا، اور وہ اپنے مالک کے دربار میں چلے گئے، وہاں ایسے گئے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا، میں جب رات کو تھوڑا پہونچا اور سلام کیا تو کوئی جواب دینے والا نہیں ملا، جواب تو ضرور آیا ہو گا، مگر میں ابھی سننے کے قابل نہیں ہوں، اس لئے انتظار ہی میں رہ گیا، اور ممکن ہے اہل اللہ کی روحوں نے گھیر لیا ہو، اسلئے ادھر توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی ہو ع

رب مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

موضوعِ زندگی مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کا موضوع تاریخ اسلام ہے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمہ اللہ کا موضوعِ زندگی اسلام کی حقانیت ثابت کرنا تھا، مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ کا موضوع مسلمانوں کا سیاسی استحکام تھا، لیکن قاری صاحب رحمہ اللہ کا موضوع کیا تھا؟ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے، ان کا موضوع تھا خدمت اور خدمت اسلام کی، مسلمانوں کی

علم کی، اس خدمت میں انکے خلوص، انکی شخصیت اور انکی بے پناہ محبت نے جادو بھر دیا تھا، پھر ہر طبقے کے اکابر کے احترام اور عزت افزائی نے دلوں کو انکی محبت سے معمور کر دیا تھا، وہ جدھر گئے سر اور آنکھوں پر بٹھائے گئے، جس مٹی کو چھو دیا سونا بن گئی، جس سمندر میں کود پڑے پایاب ہو گیا، جدھر سے گذر گئے زمین و آسمان چمکنے لگے، علماء نے سر پر اٹھایا، تاجروں نے مال و دولت نچھاور کر دی، لوگوں نے قدم چوم لئے، عوام نے دل کھول کر اس میں مجسمے نصب کر لئے، اس لئے جب وہ چلے گئے تو بوڑھے اور جوان رو پڑے، عورتیں اور بچے سر پیٹ کر رہ گئے، علم و عمل دعائیں دینے لگے، ملک بھر سے لوگ ان کی قبر پر مٹی ڈالنے کیلئے بڑی بیتابی سے اٹھ کر آ گئے، وہاں دیکھا تو

ع زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

(بشکریہ ماہی "دانشور" گورکھپور)

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

از — مولانا عزیز الحسن صدیقی

دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہو گیا، حضرت قاری صاحبؒ ہم سے کیوں روٹھ گئے! دکھوں کے مارے اور ستائے ہوئے لوگ تو انھیں مدتوں سے ستا رہے تھے، اور وہ خود بھی انکی ہمدردی و غمخواری میں اپنی خلوتوں سے نکل کر ان کے پاس چلے آتے تھے، کتنا درد تھا انسانیت کا انکے دل میں، اور اس درد کو لئے ہوئے وہ کہاں کہاں پھرے، انکے اضطراب کو کس نے جانا، انکے دکھ کو کس نے محسوس کیا، وہ خود مریض تھے مگر اپنے مرض کو بھول کر دوسروں کے مرض کو دور کرنے کی تدابیر اختیار کرتے رہے، یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم صرف جسمانی روگ کی بات کر رہے ہیں فی الاصل وہ طبیبِ روحانی تھے، اور ان کا خاص کام روحانی امراض کا علاج تھا، اس خدا بیزار دنیا میں خدا کے نام کا ڈنکا بجانا، اور انسانوں کو اس کے در پر جھکانا انکا مشن تھا۔

سفر میں تو ظاہر ہے ہر آدمی مصروف اور تھکا ہوا ہوتا ہے، مگر قاری صاحبؒ حضر میں بھی ویسے ہی مشغول و مصروف نظر آتے تھے جیسے سفر میں ہوا کرتے

تھے، درس و مطالعہ کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی خاطر مدارات اچھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی اہمیت دینا اور اسکو محسوس نہ ہونے دینا کہ اسکی طرف توجہ کم ہے، یا اسکی بات یہاں سنی نہیں جائے گی، مدرسہ کے انتظامات طلبہ اور کارکنان مدرسہ کی فکر، اتنے سارے کام وہ بیک وقت انجام دیتے تھے، ایک دو دن نہیں، ساری زندگی انکے معمولات کا یہی حال رہا، مگر کبھی وہ تھکے ہوئے نظر نہیں آئے، ہمہ وقت مستعد اور تازہ دم، ہر وقت انشراح، چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا زبان پر شکوہ، نہ دل میں کسی کی طرف سے میل ــ حضرت مولانا قاری صدیق احمد علیہ الرحمہ باندہ جیسے پسماندہ مقام پر پیدا ہوئے، اور صحرا کو نخلستان میں بدل دیا ہتھورا کے مدرسہ کو آپنے فی الواقع ایک روحانی شفاخانہ بنا دیا، یہی نہیں کہ آپ کو صرف اپنے مدرسہ کی فکر رہی ہو، ہندوستان کے ہر مدرسہ کے آپ خیر خواہ تھے، جس طرح ایک باپ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے، قاری صاحبؒ ہر مدرسہ سے محبت کرتے تھے، مشورے دیتے تھے، سفارشی تحریریں لکھ لکھ کر دیا کرتے تھے، اور دعائیں بھی کرتے تھے، عثمان عارف کا یہ شعر ان کے حال کا ترجمان تھا ؎

عارف کی نظر میں ہے کوئی دوست نہ دشمن

سارا ہی جہاں اس کو تو اپنا سا لگے ہے!

افسوس وہ خانقاہ بر دوش پیر اب ہمیں کبھی نہیں ملے گا، روحانیت کی دارو اور شفا تقسیم کرنے والا گشتی شفاخانہ ٹھہر گیا ہے، دریائے فیض کی روانی بند ہو گئی ہے، وہ کنواں جو خود پیاسوں تک پہونچ جایا کرتا تھا اب اسکو لوگ ڈھونڈتے پھریں گے، ایسا پیر و مرشد کہاں ملے گا، جو لوگوں کو دعائیں بھی دیتا تھا، اور اپنے پاس بٹھا کر روٹیاں بھی کھلاتا تھا، ایسا بزرگ کہاں ملے گا جو مریدوں کو خود نذرانے دیا کرتا تھا ع ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

قاری صاحبؒ! ہم نے آپکو نہیں پہچانا، اور آپ نے بھی اپنے آپکو چھپائے رکھا، ہم آپ کے بدن پر گرے مگر آپ نے برا نہ مانا، ہم آپ کے معمولات میں مخل ہوتے رہے، مگر آپ کبھی ناراض نہیں ہوئے، آپ ہمہ وقت بے چین رہتے تھے، اضطراب کی ایک لہر تھی جو آپ کے وجود میں سما گئی تھی، لگتا تھا کہ کوئی چیز کھوگئی ہے جس کی تلاش میں آپ سرگرداں ہیں، وہ متاعِ گرانمایہ جس کی جستجو میں آپ نکلے تھے یقیناً آپ کو مل چکی ہے جبھی تو آپ سب سے منہ موڑ کر وہاں چلے گئے، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا، اللہ آپ کے مسکن کو ٹھنڈا رکھے، اور اس پر آسمان ہمیشہ شبنم افشانی کرتا رہے، آپ نے جابجا جو پودے لگائے ہیں وہ ہمیشہ شاداب رہیں۔

(شکریہ رسالہ "تذکیر" غازیپور)

علم حاصل کرنے میں محنت کرنا

طالب علم کو چاہئے کہ اچھی طرح محنت کرے، اپنے اوقات کو ضائع نہ کرے، علم حاصل کرنے میں ہرگز سستی اور کاہلی سے کام نہ لے، کیونکہ کاہلی علم سے محرومی کا باعث ہوگی۔

سلف کی زندگی پر غور کرے کہ انھوں نے کیسی محنت کی ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" (جن لوگوں نے ہمارے لئے جد وجہد کی تو ضرور ہم انکو سیدھی راہ دکھائیں گے)۔

(از — عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہ)

عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی

کی

ملک کے خیر خواہوں سے دردمندانہ اپیل

ارباب حکومت سے آپ کو مالک نے ملک کا نگراں بنایا ہے، آپ ایسی حکومت کریں جس سے تمام رعایا کو سکھ اور چین کی زندگی نصیب ہو، پہلے کے حکمران اپنی رعایا کو اولاد کی طرح سمجھتے تھے، اور ان کے ہر دکھ درد کا خیال کرتے تھے، ہر ایک کی جان ومال، عزت و آبرو کی حفاظت، اور انصاف کرتے تھے، مظلوموں، غریبوں اور بیواؤں کی خبر گیری رکھتے تھے، آجتک لوگ انکو یاد کرتے ہیں، آپ بھی یہی طریقہ اختیار کریں، اگر ان لوگوں کا طریقہ اختیار کیا جاتا تو ملک بدنام اور برباد نہ ہوتا۔

ہندو بھائیوں سے آپ جس مذہب کو مانتے ہیں، اپنے کاموں سے اس کو بدنام نہ کیجئے، کیا مذہب یہ سکھاتا ہے کہ دوسروں کی جان ومال، عزت و آبرو کو نقصان پہونچایا جائے، جتنے رشی منی گذرے ہیں انکا کیا عمل تھا، انہوں نے اہنسا کا پرچار کیا ہے، انہوں نے کسی کو نہیں ستایا اچھا کام کیا، اور سب کو اچھا بنانے کی کوشش کی، اپنے کو مصیبت میں ڈال کر

جنگلوں میں پریشانی کی زندگی گذاری، بن باس لیا، لیکن کسی کا دل نہیں دکھایا آپ انکے طریقے پر چلیں اور جھگڑا فساد کرکے ملک کو برباد نہ کریں۔

مسلم بھائیوں سے

آپ حضرات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیغمبر مانتے ہیں، آپ غور کیجئے کہ انھوں نے جو کچھ بتایا ہے آپ اس پر عمل کر رہے ہیں یا نہیں، انہوں نے تو سب کیساتھ اچھا معاملہ کرنے کو بتایا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ جس نے تمکو پیدا کیا اسکی عبادت کرو، جو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو، ساری مخلوق کے ساتھ بھلائی کرو، غریبوں کی مدد کرو، ان سے کوئی بھید بھاؤ نہ رکھو! کوئی تمہارے مذہب کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو، سب کے ساتھ انصاف کرو، بھلائی کرو۔

اپنے پیغمبر کی زندگی دیکھو! انکو جو لوگ ستاتے تھے اور تکلیفیں پہنچاتے تھے وہ ان سب کیساتھ اچھا معاملہ کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کا مخالف بھی ان کو برا نہ کہتا تھا، کتاب و سنت کو چھوڑ کر آپ بدنام ہو رہے ہیں، اور اپنے مذہب کو بدنام کر رہے ہیں، اپنی زندگی بدلئے! اور اپنے مذہب کی بتائی ہوئی تعلیم پر عمل کیجئے! سب کے ساتھ اچھا معاملہ کیجئے، جھگڑا فساد کرکے ملک کو برباد اور اپنے مذہب کو بدنام نہ کیجئے۔

سادھوؤں اور سنتوں سے

آپ اپنے مذہب کے پیشوا ہیں، آپکو لوگ اپنا بڑا سمجھتے ہیں، آپکی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتے ہیں، مذہب برا کام نہیں سکھاتا، کسی سے دشمنی نہیں سکھاتا، کسی کے نقصان کی اجازت نہیں دیتا، آپ اپنے تمام ماننے والوں کو سمجھائیے کہ سب کو اپنا بھائی سمجھیں سب کے ساتھ بھلائی کریں، جن دیوتاؤں کے نام پر فساد کر رہے ہیں، انھوں نے اسکی سیکھ نہیں دی، وہ تو برے کام سے بچتے تھے اور سب کو بچاتے تھے، سب کے ساتھ بھلائی کرتے تھے، خود پریشانی اٹھاتے تھے، دوسروں کو پریشان نہیں

کرتے تھے، اگر آپ لوگ اپنی قوم کو نہیں سمجھاتے تو ملک برباد ہو جائے گا۔

مسلمانوں کے رہنماؤں اور علماء سے

ملک کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں، مسلمانوں کے جو اعمال ہیں وہ بھی آپ دیکھ رہے ہیں، یہ ساری مصیبتیں بداعمالیوں کی بناء پر ہیں، زندگی کے کسی شعبے میں اسلام کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل نہیں ہو رہا ہے، خدا کے گھر آج تک نہ آباد ہو سکے، کفر کے گھر خالی ہیں جہاں خدا اور رسول کا نام نہیں لیا جاتا ہر طرح کے خرافات میں زندگی گذر رہی ہے، کسی کی جان و مال کا نقصان کرنا مسلمان کا کام نہیں۔

ایسی صورت میں آپ کو کیا کرنا چاہئے یہ آپ سوچئے ہر ہر بستی، ہر ہر گھر، ہر ہر شخص کے پاس جاکر اسکو سمجھانا، اپنے پروردگار، اور اپنے پیغمبر کی طرف جھکانا، گناہوں سے توبہ و استغفار کی تعلیم دینا، اسلامی حدود میں رہ کر غیر مسلموں کے ساتھ بھائی چارگی اور رواداری برتنا اور اس پر عمل کرانا، ہر مسلمان کو سچا مسلمان بنانا یہ وقت کا اہم فریضہ ہے، اس کے لئے وقت نکالئے، اور اپنی جیسی کوشش میں کوتاہی نہ کیجئے! وَالامرُ بِیدِ اللّٰہ۔

ہر جماعت کے لیڈروں اور اخبار کے ایڈیٹروں سے

آپکو پیدا کرنیوالے نے زبان و قلم کی طاقت دی ہے، آپ اس سے ملک میں امن و سکون، چین و راحت کی فضا پیدا کر سکتے ہیں جس سے ملک کا ہر بسنے اور بسنے والا اطمینان اور بے خوفی کی زندگی گذار سکتا ہے، اور ملک کو باغ و بہار بنا سکتا ہے، اسکے برخلاف اگر آپ چاہیں تو ایک بیان سے ملک میں بدامنی، خوف و ہراس، جھگڑا و فساد اور خونریزی کرا کے ملک کو آگ کی بھٹی بنا سکتے ہیں، آپ لوگ اپنی ذمہ داری کا احساس کیجئے! کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالئے، کوئی ایسی تحریر اور بیان نہ شائع کیجئے جس سے ملک برباد ہو جائے •••

منظوم خراجِ عقیدت

از:- مولانا حکیم ابرار احمد صاحب جمداشاہی، بستی
(رکن مجلس شوریٰ دار العلوم الاسلامیہ بستی)

عزیزم مولانا محمد اسعد صاحب سلمہٗ اڈیٹر فکر اسلامی

سلام مسنون

حضرت مرشدنا و مولانا عارف باللہ قاری سید صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ وفات پر احباب کی خواہش و فرمائش، اور آپ کے اصرار و ہمت افزائی سے یہ ایک نظم بطور نذرانۂ عقیدت پیش ہے، فکر اسلامی میں شائع کردیں، تو میرا نام بھی خریداران یوسف میں شامل ہوجائے۔

ابرار احمد

مجھ سے کہتے ہیں مرثیہ لکھوں — اور میں سوچتا ہوں کیا لکھوں
راہِ حق میں جو مرتے جیتے ہیں — میں انھیں کس طرح مرا لکھوں
جسکی صورت بسی ہو ہر دل میں — کیوں اسے میں چلا گیا لکھوں
صدق و مہر و وفا کے پیکر کو — کونسا لفظ لاؤں کیا لکھوں
ہاں مگر ایک بات ایسی ہے — میں اسے لکھوں برملا لکھوں
ایک قندیل ظلمتِ شب میں — رہ نمائے رہِ ھدیٰ لکھوں

دست گیری کرے جو منزل تک | میں انھیں ایسا رہنما لکھوں
زندگی کی اداس راہوں میں | ایک سایہ امید کا لکھوں
غم کے ماروں کا مرکز تسکیں | بے سہاروں کا آسرا لکھوں
اک تبسم ہزار دکھ کی دوا | گفتگو! نسخۂ شفا لکھوں
سایہ گستر سروں پہ ابر کرم | میں نے دیکھا ہے کیوں سنا لکھوں
ان کا تقوی اور انکی دیں داری | کھلا صفحہ ہے اسکو کیا لکھوں
آدمی ہونا ہی تو مشکل ہے | آدمی تھے تو کیا سوا لکھوں
بن کے چھوٹوں میں رہتے تھے چھوٹے | اس بڑے کو نہ کیوں بڑا لکھوں
ان کا فیض تمام جاری ہے | کیا غلط ہے جو مدرسہ لکھوں
متوازن رہے قلم میرا | دھیان ہے! ورنہ کیا سے کیا لکھوں
ایک آیت زمین پر حق کی ہے | امر رب جلیل کا . . . . لکھوں
شمع دیں کا کہوں جو پروانہ | کشتۂ عشق مصطفٰے لکھوں
راہ حق کا انھیں کہوں رہبر | کشتیٔ دیں کا ناخدا لکھوں
انکو میخانۂ طریقت کا | ایک ساقیٔ دل ربا لکھوں
اُن کی رفتار موج باد نسیم | یعنی جنت کا در کھلا لکھوں
جہاں ٹھہرے ٹھہر گیا ہے وہیں | زندگانی کا قافلہ لکھوں
نام صدیق، کام صدق و وفا | اسے لکھوں تو مرحبا لکھوں
مانگنے سے سوا ملا ہوگا | ان کو اب کون سی دعا لکھوں
وہ مرے دل کے پاس ہیں ہر دم | میں انھیں کس طرح جدا لکھوں

دل میں اک پھانس ہے مگر ابرار
اس کی تعبیر کیا ہے؟ کیا لکھوں؟

مرقعِ شیخ

بیادِ عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی رح

اسکو خوردوں نے کہا ہو جیسے
اور خود میں نے سنا ہو جیسے

اپنے مرشد کا مرقع لکھوں
ایک نشہ سا چڑھا ہو جیسے

روئے پرنور کا البیلا نکھار
صحن میں پھول کھلا ہو جیسے

چشم میگوں سے ٹپکتا جادو
آخرِ شب کی دعا ہو جیسے

دردِ ملت سے ابلتا سینہ
ایک سیلاب رکا ہو جیسے

ایک دھن ایک طلب ایک تلاش
قیس صحرا کو چلا ہو جیسے

کرتی اٹھکھیلیاں پھرتی ہے صبا
میرے حضرت کی ادا ہو جیسے

جس جگہ پہونچے وہیں آئی بہار
یعنی ساون کی گھٹا ہو جیسے

مردہ روحوں کیلئے بول ان کے
قُم باذنی کی صدا ہو جیسے

یاد جب ان کی کبھی آئی ہے
دل میں اک درد اٹھا ہو جیسے

تیرے اشعار کی مستی ابرار!
درِ میخانہ کھلا ہو جیسے

تأثرات

بر وفاتِ حسرت آیات

مخدومِ گرامی حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ

بانی و ناظم جامعہ عربیہ ہتھورا ضلع باندہ یوپی

از : حضرت مولانا محمد عبد القیوم صاحب شاکر القاسمی دامت برکاتہم

مرشدِ عالم کی رحلت سے ہیں ہم سینہ فگار
ہو رہی ہے یہ خبر قلب و جگر کے آر پار

حادثہ ایسا پڑا اسلامیانِ ہند پر
ملک کا خورد و کلاں پیر و جواں ہے سوگوار

غنچہ غنچہ پتا پتا ہے چمن کا مضمحل
بلبلانِ گلشنِ ہندوستاں ہیں اشکبار

حضرت صدیق کی رحلت ہے ایسا سانحہ
عالمِ اسلام ہے جسکے سبب سے دل فگار

اٹھ گیا اف علم و فن کی سلطنت کا بادشاہ
چل بسا دنیا سے ملکِ معرفت کا تاجدار

ناگہاں ہم پر گرا ہے آج وہ کوہِ الم
دامنِ صبر و تحمل ہو نہ جائے تار تار

حادثہ ہے سخت یا رب رکھ ہمیں ثابت قدم
صبر کی توفیق دے ہم سب کو اے پروردگار

رحلتِ آنمحترم پر شورِ ماتم کیوں کریں ؟
صبر و تسلیم و رضا ہے اہلِ ایماں کا شعار

رنج و غم دنیا کے آخر آپ اٹھاتے تا بکے
دیدیا انکو خدا نے اپنی رحمت کا جوار

کیوں نہ کرتے آپ علیین کی جانب سفر
اہلیہ کو، والدہ کو تھا نہایت انتظار

رات دن کی جانفشاں سے انھیں فرصت ملی
لوٹتے ہونگے یقیناً آپ جنت کی بہار

تھا یہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو ملا آخر قرار[عہ]

عہ حضرت جگر کی روح سے معذرت کیساتھ ۔

اِک نمونہ حضرتِ اقدس تھے از خیر القرون — اپنے اسلاف واکابر کی حقیقی یادگار
فقرِ حیدرؓ، شانِ بوذرؓ آپکی فطرت میں تھی — اِک نمونہ تھے صحابہؓ کا بلفضل کردگار
حق تعالیٰ نے انھیں دی تھی عجب محبوبیت — شہرت ومقبولیت ان کی تھی عالم آشکار
اہلِ دل یوں چہرۂ انور پہ کرتے دل فدا — جس طرح سے شمع پر ہوتے ہیں پروانے نثار
دیدیا اللہ نے تعویذ میں ایسا اثر — روز ہی آتے "تھوَرا" اہلِ حاجت بیشمار
راحت وآرام کا اپنے نہ کرتے کچھ خیال — خلق کی حاجت روائی میں رہے لیل ونہار
"برق گرتی ہے کسی پر اور تڑپتے ہیں امیرؔ"[عـــہ] — ہے کوئی بیمار حضرت ہو رہے ہیں بیقرار
میہمانوں کیلئے الوانِ نعمت کا تھا نظم — روکھا سوکھا واسطے اپنے کیا تھا اختیار
جیب خالی تھی اگرچہ قلبِ اطہر تھا غنی — آپ میدانِ قناعت کے تھے پختہ شہسوار
آپ کی مجلس میں ہوتی سب کی قدر ومنزلت — وہ فقیرِ بے نوا ہو یا کوئی سرمایہ دار
تھے علومِ ظاہری میں ماہرِ ہر علم و فن — اور علومِ باطنی کے بحرِ ناپیدا کنار
شرح فرماتے تھے ایسی مشکلاتِ درس کی — کہ رُخِ مفہوم ہو جاتا تھا اکدم بے غبار
ایسا عالِم ایسا عارف جسکے فرزندوں میں ہو — کیوں نہ اُس ملت کی اونچی ہو کلاہِ افتخار
جس پہ ڈالی اِک نظر اس کی گئی کایا پلٹ — اِک گھڑی صحبت میں جو بیٹھا ہوا وہ دیندار
جس جگہ پہونچے وہاں بادِ بہاری آگئی — جس جگہ رکھا قدم صحرا ہوا وہ لالہ زار
تھا "تھورا" بیگماں صحرائے بے آب وگیاہ — آپ کی محنت سے کیسا ہو گیا باغ وبہار
"جامعہ" ہے حضرتِ اقدس کی ایسی یادگار — فیض جاری ہی رہے گا محترم کا تا ابد
کام ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ آپ ہوتے تھے شریک — مہتمم دیکھا نہیں ایسا کوئی خدمت گذار
جامعہ میں ہوتا جب بیمار مہمانِ رسولؐ — آپ خود ہوتے تھے اُس بیمار کے تیماردار
میکدہ ہے دور میں ساغر ہے اِسکے باوجود — ڈھونڈھتا ہے پیرِ میخانہ کو ہر اک بادہ خوار
تشنہ کامانِ محبت کے لئے آبِ حیات — چلچلاتی دوپہر میں ایک نخلِ سایہ دار

عـــہ حضرت امیرؔ کی روح سے معذرت کیساتھ۔

ذرۂ ناچیز پر چشم عنایت تھی بہت
آپکے حلقہ بگوشوں میں تھا اپنا بھی شمار

گرچہ ہم تھے ہیچ و ناکارہ سیہ نامہ مگر
آپ سے وابستگی تھی وجہ تمکین و وقار

اِن اداروں[عہ] سے تعلق آپ کو تھا بے پناہ
اس لئے تشریف لاتے تھے یہاں پر بار بار

اے دلِ ناداں نہیں آئیں گے حضرت اب کبھی
راہ کس کی دیکھتی ہے اے نگاہِ انتظار

ہاں مگر ملتا رہے گا ان سے فیضِ باطنی
مثلِ سابق فیض روحانی رہے گا برقرار

ہو نہیں سکتا کبھی محروم ان کا ہم نشیں
کیا تعجب ہے ہمیں بھی بخش دے آمرزگار

شاکرِ خستہ جگر اب روک دے اپنا قلم
ان کے اوصاف و محاسن کر نہیں سکتا شمار

آپ کی تربت پہ برسا ہی کرے ابرِ کرم
اور پیہم ہو نزولِ رحمتِ پروردگار

[عہ] دار العلوم الاسلامیہ بستی و مدرسہ عربیہ اصلاح المسلمین جمدا شاہی بستی ۔

نذرِ عقیدت

ضیاء الرحمٰن ضیا نعمانی

وہ کون ہے کہ دل کی تمنا کہیں جسے
خاتم پہ قیمتی سا نگینہ کہیں جسے

سادات کا لہو تھا رگ و پے میں موجزن
نورِ نگاہِ فاطمہ زہرا کہیں جسے

بابائے قوم، سید ملت عزیزِ ملک
سادات کی نگاہ کا تارا کہیں جسے

اورنگ زیبِ عقل جہانگیرِ علم و فن
آئینۂ سکندر و دارا کہیں جسے

اللہ رے وہ پھونک مسیحائی یاد آگئے
ایسی زباں کہ شہد مصفّٰی کہیں جسے

پانی پہ چل رہا تھا مگر ڈوبتا نہ تھا
دنیا میں رہ کے تارکِ دنیا کہیں جسے

علم و عمل میں وارثِ سالارِ انبیاءؐ
جلوہ نمائے سیرتِ آقا کہیں جسے

الحاج شاہ حضرتِ اسعدؒ کے فیض سے
ترشا ہوا کمال کا ہیرا کہیں جسے

کیونکر نہ جاں نثار کریں اس پہ اے ضیا
شیدائے شاہِ گنبدِ خضرا کہیں جسے

تأثراتِ غم

برانتقالِ پُرملال

مخدومِ گرامی حضرت مولانا قاری سیّد صدّیق احمد صاحب باندوی قدس سرہٗ

از
مولانا نثار احمد قاسمی
استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

●●●

اپنا رہبر کون ہے اب؟ اپنی منزل کیا کہوں؟
جادۂ الفت میں اب کتنے ہیں بسمل کیا کہوں؟
کتنی لاحاصل تمناؤں کا حاصل کیا کہوں؟
ہے بھنور میں اپنی کشتی دور ساحل کیا کہوں؟
نورِ ثاقب[1] کھو گیا، حیرانیٔ دل کیا کہوں؟
اپنی مشکل کیا کہوں؟ اے دل غمِ دل کیا کہوں؟

فون پر کس نے خبر دی دل مرا تھرا گیا!
موج دل کا یہ تلاطم جسم و جاں پر چھا گیا!
عالمِ دین میں، وہ قطب عالم چل بسا!

---

[1] ثاقب: حضرت والا اپنے اشعار میں بطور تخلص اسکو استعمال کرتے تھے۔

نام تھا صدیق، وہ مجموعۂ صدق و صفا!
جس کے دم سے جل رہی تھی شمع محفل کیا کہوں؟
اپنی مشکل کیا کہوں؟ اے دل غم دل کیا کہوں؟

جادۂ علم و ہنر کا وہ مجاہد وہ فقیر
خانقاہیں اور مدارس جسکے دم سے مستنیر
روز و شب مصروفیت ہر لمحہ فکر بے نظیر
وعظ اور تصنیف اور تدریس کا بدر منیر
تھا ابھی تب تاب ہے روپوش منزل کیا کہوں؟
اپنی مشکل کیا کہوں؟ اے دل غم دل کیا کہوں؟

ایک متکلم، محدث، اک فقیہ بے مثال!
ایک شاعر، ایک صوفی، فیض جسکا لازوال
ایک واعظ، ایک مصلح، اک مدرس باکمال
جسکی ہر ہر بات موتی، ہر نفس آب زلال
ایک دنیا اس کی محفل میں تھی شامل کیا کہوں؟
اپنی مشکل کیا کہوں؟ اے دل غم دل کیا کہوں؟

عزم میں ایسا کہ از کوہ گراں مضبوط تر!
جذب و استغنا کی تھے وہ اک مثال خوب تر
سادگی میں جلوہ آرائی کہ ہو رشک قمر
تھا رواں پیہم رواں ہر دم جواں عزم سفر
ہو گئے بیدار ان سے کتنے غافل کیا کہوں؟
اپنی مشکل کیا کہوں؟ اے دل غم دل کیا کہوں؟

وہ جنید وقت وہ امداد و اشرف کا وقار
اسعد اللہ مظاہر کا نہال سایہ دار
چارہ گر ہر شخص کا ایسا کہ ہر دم بے قرار
ہر ادائے زیست ایسی تھی کہ سو جاں سے نثار
کون ہوگا اب ؟ ہے کہنا سخت مشکل کیا کہوں ؟
اپنی مشکل کیا کہوں ؟ اے دل غم دل کیا کہوں ؟

آہ وہ دست مسیحا وہ نگاہ پاکباز
قلب سوزاں سے نکلتی گفتگوئے دل نواز
آہ وہ انسانیت کا چارہ گر اور چارہ ساز
آہ وہ دار العلوم اسلامیہ[1] کا خاکہ ساز
ہو گیا خاموش اب وہ شیخ کامل کیا کہوں ؟
اپنی مشکل کیا کہوں ؟ اے دل غم دل کیا کہوں ؟

یادگار حضرت مرحوم ہیں بھائی حبیب
قوت بازو ہیں انکے یہ حسیب یہ نجیب
غمزدہ بہنوں کا غم ہے لائق حسرت عجیب
سایۂ ابر کرم ہو ان پہ اے نعم المجیب
قادر مطلق ہے تو ، اور خالق الکل کیا کہوں ؟
اپنی مشکل کیا کہوں ؟ اے دل غم دل کیا کہوں ؟

---

[1] حضرت قاری صاحبؒ نے مراد آباد میں حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہ العالی بانی و صدر دار العلوم الاسلامیہ سے فرمایا تھا کہ آپ کو اللہ پاک نے دینی خدمات کی بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے ان سے کام لیکر اپنے وطن بستی کیلئے کچھ کریں ، حضرت کے مذکورہ ارشاد کی تعمیل میں دار العلوم الاسلامیہ وجود پذیر ہوا ، اور اب تک اس کی سرپرستی ، اور مکمل فکر حضرتؒ فرماتے رہے ۔

ایک دو باتیں ہی کہہ سکتا ہوں ان کی اے نثار
کہنے کو اس ہستیِ کامل کی باتیں ہیں ہزار
اب تو میں رہتا ہوں ہر دم رنج وغم سے سوگوار
چشم تر ہے، اور دلِ محزون ہے بے صبر و قرار
اے مرے دل اے مرے دل اے مرے دل کیا کہوں؟
اپنی مشکل کیا کہوں؟ اے دل غم دل کیا کہوں؟

میرے حضرت تھے امانت آپ کی پروردگار
آپ کا ہم سب پہ ہر دم ہر طرح ہے اختیار
صبر کی توفیق دے، کر انکے زمرہ میں شمار
رحمتیں ان پر تری ہوں بے شمار و بار بار
کشتیٔ دل کا الٰہی تو ہے ساحل کیا کہوں؟
اپنی مشکل کیا کہوں؟ اے دل غم دل کیا کہوں؟
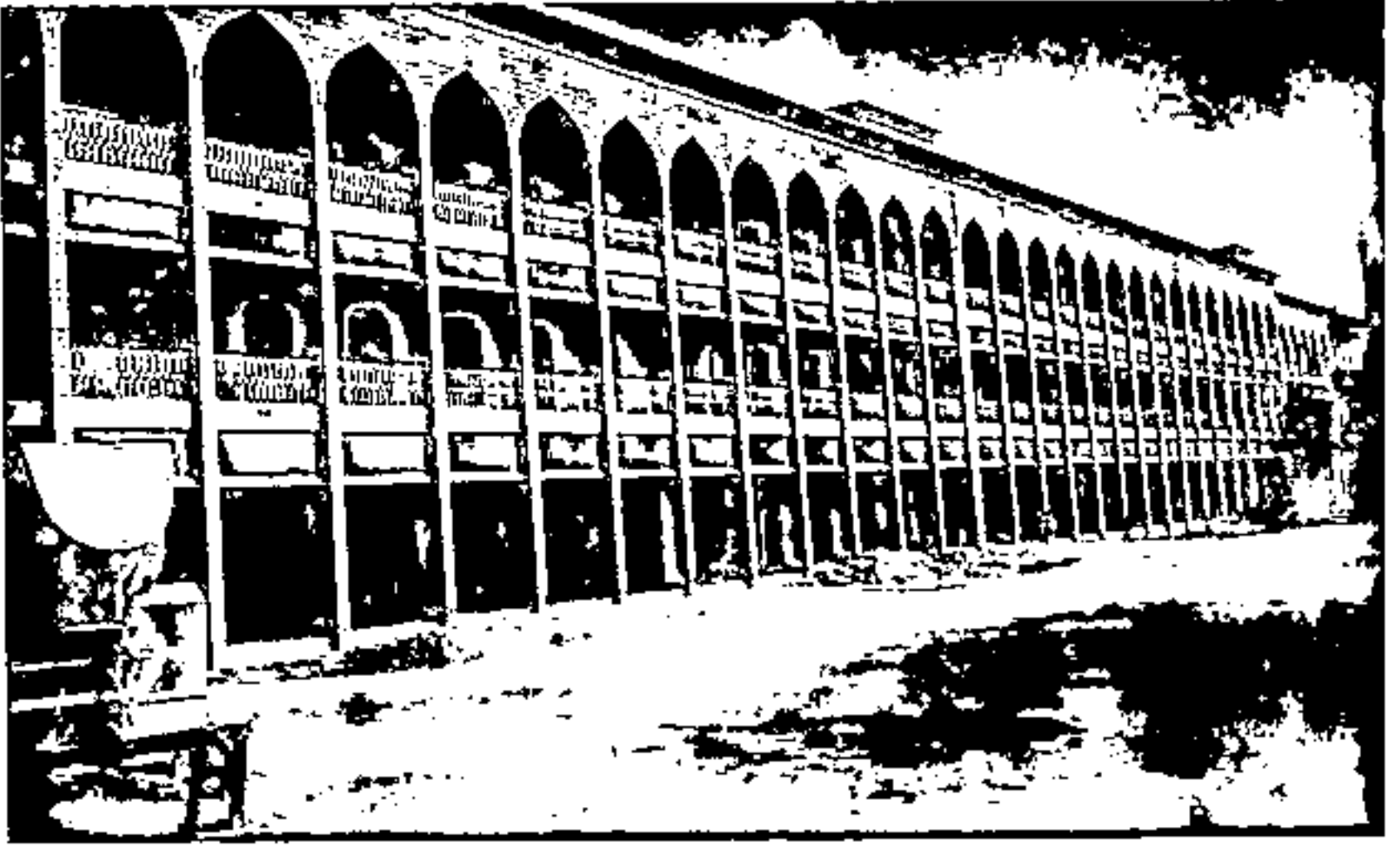
دارالعلوم الاسلامیہ کی درسگاہوں کا ایک منظر